جون ۱۹۶۶ء

جلد ۶۵ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جون سنہ ۱۹۶۶ء	جلد ۶۵

چندہ سالانہ — دفتر ماہنامہ ترجمان القرآن — قیمت فی پرچہ

سات روپے — ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور — ۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پچھلے دنوں مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں پر جو آفت آئی تھی اس کے نتیجہ میں تاثر توڑ ایک لاکھ ۲۵ ہزار مسلمان انتہائی تباہ حالت میں آزاد کشمیر کی طرف ہجرت کر کے آ گئے تھے۔ ان مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت کے لیے جماعت اسلامی نے عوام الناس سے امداد کی اپیل کی، اور جو امداد اس کو عوام سے ملی اس کے ذریعہ سے جماعت کے کارکنوں نے کام شروع کر دیا۔ اس موقع پر یہ ہمارا فرض ہے کہ جن لوگوں نے اس کارِ خیر میں ہمارا ہاتھ بٹایا تھا ان کو یہ بتا دیں کہ جو ذرائع و وسائل انہوں نے ہم کو فراہم کیے تھے ان سے کیا کام کیا گیا ہے۔ یہاں ان خدمات کا ذکر کسی جذبۂ نمائش و افتخار کی بنا پر نہیں بلکہ اسی احساس ذمہ داری و جواب دہی کی بنا پر کیا جا رہا ہے۔ یہ حقیر سی سعی جو ہم نے اپنے ستم زدہ اور آفت رسیدہ بھائیوں کی خدمت کے لیے کی ہے اسے ہم اپنا کوئی کمال نہیں سمجھتے۔ یہ محض باری تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُس نے ہم جیسے گنہگار اور عاجز بندوں کو اس نیک کام کی توفیق دی اور لوگوں کے دلوں میں ہمارے متعلق وہ حسنِ ظن پیدا کیا جس کی بنا پر انہوں نے ہم پر غیر معمولی اعتماد کرتے ہوتے روپے پیسے، دواؤں اور ہر قسم کے سامان سے ہماری مدد فرمائی۔ اگر خدا کا خصوصی فضل ہمارے شاملِ حال نہ ہوتا اور عوام پوری فراخدلی اور جذبۂ ایثار کے ساتھ اس کام میں ہماری معاونت نہ کرتے تو ہم اسے کبھی بھی سرانجام نہ دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں عنایات کے لیے ہم اُس بزرگ و برتر ذات کے حضور میں سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں اور اُس قادرِ مطلق کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری اس حقیر سی خدمت کو قبول فرمائے۔ ہماری کوتاہیوں، لغزشوں سے درگزر کرے اور آخرت کے دن ہمیں اپنے

مطیع اور فرمانبردار بندوں کی صف میں اٹھائے۔ جن حضرات نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے اُن کے لیے بھی ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے مالک الملک کے حضور میں دُعا گو ہیں۔ انہوں نے اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کے لیے جس ایثار سے کام لیا ہے اور ہمارے ساتھ جس اخلاص و اعتماد کا ثبوت دیا ہے اللہ اُس کے لیے اُنہیں اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ اَنْتَ وَلِيُّنَا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ۔

ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تعصب نے یوں تو ہندوستان کی ساری اقلیتوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک وہ کر رہے ہیں اُس کی انسانوں سے کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ خاص طور پر مقبوضہ کشمیر کے بے بس مسلمان جنہیں اُمن کے پُجاریوں اور اہنسا کے علمبرداروں نے اخلاق، دیانت، شرافت اور عدل کے سارے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، کئی سال سے ان کے ظلم و ستم کے ہدف بنے ہوئے ہیں۔ بھارت کی حکومت ہر وہ ممکن تدبیر اختیار کرتی رہی ہے جس سے انہیں غلامی پر رضا مند کیا جا سکے۔ لیکن اُن کی فطرت نے سارے دکھ سہنے کے باوجود اپنی آزادی کی رُوح کو دبنے نہیں دیا۔ انہوں نے اپنے اس پیدائشی حق کے حصول کے لیے عدل و انصاف کے سب سے بڑے ادارے اقوامِ متحدہ کے دروازے پر دستک دی آزاد قوموں کے ضمیر سے اپیل کی، لیکن مادیت کے اِس دَور میں جبکہ دنیوی مصالح ہر چیز پر غالب ہیں، ان بے بسوں کی کہیں بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر انہوں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنی آزادی کے حصول کے لیے از خود جد و جہد شروع کرنے کا عزم کر لیا۔

ان کی طرف سے اس اقدام کا آغاز ہوتے ہی بھارت کی درندگی و بہیمیت پوری طرح بدمست

ہو کر گذشتہ اگست میں اُن پر ٹوٹ پڑی اور انہیں ایسے خوفناک مظالم کا تختۂ مشق بنایا جن کو اگر درندوں کی طرف بھی منسوب کیا جائے تو وہ بھی شدید احتجاج کے ساتھ اپنی برأت کا اظہار کریں۔ امیر جماعت اسلامی نے جب اپنے رفقاء کے ساتھ آزاد کشمیر کا دورہ کیا اور مقبوضہ کشمیر سے آنے والے مہاجرین کی زبان سے اُن پر ڈھائے گئے مظالم کی داستانیں سنیں تو فرمایا کہ یقین نہیں آتا کہ جن لوگوں نے انسانوں پر یہ مظالم کیے وہ انسان تھے۔ ایک شخص نے انہیں بتایا کہ اُن کے سامنے بارہ مسلمانوں کی آنکھیں نکالی گئیں؛ زندہ آدمیوں کو سر سے لیکر پاؤں تک چیر ڈالا گیا، لوگوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دی گئی۔ ایک مہاجر ذیلدار نے جو اپنے علاقے کا معزز آدمی تھا بتایا کہ جالیاں نامی گاؤں کے لوگوں کو پولیس تسلی دے کر اپنے ساتھ لے گئی اور پھر ان سب پر مٹی کا تیل چھڑک کر انہیں آگ لگا دی گئی۔ تحصیل سوپور کے گاؤں ٹنکوٹ کے عالم محمد امین کو بال بچوں سمیت زندہ جلا دیا گیا۔ نگینہ کے ہدایت اللہ سے جبراً لکڑیاں جمع کرائی گئیں اور پھر اُسی کے جمع کیے ہوئے ڈھیر پر بٹھا کر اُسے زندہ جلا دیا گیا۔ چار آدمیوں کو ان کی پیشاب کی نالیوں میں گرم سلاخیں ڈال کر ہلاک کیا گیا۔ بکثرت عورتیں آزاد کشمیر کے ہسپتالوں میں موجود ہیں جن کے پستان دانتوں سے کاٹے گئے تھے۔ تحصیل کپواڑہ کے موضع کاشی کے عالم دین کو قتل کر دیا گیا اور ان کی چار لڑکیوں کو اغوا کیا گیا جن میں سے دو اُسی روز مُردہ پائی گئیں اور دو ہسپتال میں اس حالت میں پہنچیں کہ خون جاری تھا۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق صرف سرینگر سے دو ہزار سے زائد لڑکیاں اغوا کی گئیں۔

یہ دردناک واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ اس قدر ناقابلِ تردید ہیں کہ ان کی تصدیق غیر ملکی اخبار نویسوں نے بھی بڑے واشگاف الفاظ میں کی ہے۔

ہندوستان کا یہ سارا شرمناک کھیل کوئی غیر متوقع نہ تھا۔ جس دن مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی نے زور پکڑا اور اس کی خبریں اخبارات میں آنی شروع ہوئیں، اسی دن یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا

کہ مقبوضہ کشمیر میں یہی کچھ پیش آنے والا ہے۔ بھارت کی متعصبانہ ذہنیت اور اس کے سفاکانہ عزائم کے پیش نظر آنے والے مصائب کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسی بنا پر اگست ہی میں قوم سے مہاجرین کی معاونت کے لیے اپیل کر دی تھی۔ اللہ نے بروقت مدد فرمائی اور اس اپیل کا توقع سے بڑھ کر اثر ہوا۔ لوگوں نے جماعت اسلامی کو روپے، کپڑے، دوائیں، بستر اور برتن فراہم کرنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی مدت نہ گزری تھی کہ مقبوضہ کشمیر سے مظلوم مہاجرین کے لٹے ہوئے قافلے آزاد کشمیر کی طرف انتہائی تباہ حالت میں آنے لگے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی گھر یا خاندان ایسا تھا جو ہندو غنڈوں کے مظالم کا نشانہ نہ بنا ہو۔ ان میں سے کثیر تعداد ایسے ستم زدوں کی تھی جن کی عزت و آبرو پر بڑے شرمناک حملے ہو چکے تھے، جن کی بہو، بیٹیاں غائب تھیں، جن کے نوجوانوں کو اُن کی آنکھوں کے سامنے عبرتناک عذاب دے دے کر شہید کیا گیا تھا، جو اپنے معصوم بچوں کا قتل اپنے سامنے دیکھ چکے تھے۔ جنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے اپنی بستیوں اور گھروں کو جلتے دیکھا تھا۔ یہ لوگ کئی دن بھوکے پیاسے رہ کر سفاک اور کمینے دشمن کے تعاقب سے بچ بچا کر اور مسلسل خوف اور ہراس کی حالت میں طویل مسافت کی صعوبتیں سہہ کر، بڑی بے سروسامانی کے عالم میں آزاد کشمیر کے اندر داخل ہوئے۔ جن لوگوں نے ان بیچاروں کی وہ حالتِ زار دیکھی ہے وہی ان کی بے بسی اور مظلومیت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کے جسم زخموں سے چور تھے، مسلسل چلنے کی وجہ سے ان کے پاؤں سُوج رہے تھے، پیہم فاقوں نے انہیں نڈھال کر رکھا تھا۔ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے کوئی کپڑا نہ تھا بلکہ عورتیں اپنے ستر تک چھپانے کے لیے اپنے پاس کوئی لباس نہ رکھتی تھیں۔ ان صبر آزما حالات میں گزرنے کی وجہ سے یہ لوگ کئی قسم کے ذہنی اور جسمانی عوارض میں مبتلا تھے۔ غم انسان کو ضرورت سے زیادہ حساس بنا دیتا ہے اور اُس کی قوت برداشت کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس سے انسان کے اندر چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ذرا ذرا سی بات سے برہم

ہو کر آپے سے باہر ہونے لگتا ہے غم زدہ انسان کے احساسات خاص طور پر اُس شخص یا گروہ کے بارے میں غیر معمولی حد تک نازک ہوتے ہیں جسے وہ اپنے غم میں شریک دیکھنا چاہتا ہے اور جس کی طرف اپنی محرومیوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے وہ دستگیری کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے

جماعت اسلامی کے کارکنوں نے مقبوضہ کشمیر کے مہاجرین کی حالتِ زار کو سامنے رکھتے ہوئے اور ان کی نفسیات اور ان کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے وسط اگست میں اپنے کام کا آغاز کیا اور ستمبر میں اس کے کارکنوں نے کئی کیمپوں میں باقاعدہ مختلف خدمات سرانجام دینی شروع کر دیں۔ مہاجرین کے قافلے مسلسل آتے رہے اور ۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء تک ۱۲۴۸۵۷ افراد نے قریب قریب بارہ کیمپوں میں پناہ لی۔ ان کیمپوں میں باغ، ریڑا، ہجیرہ، تراڑکھیل، میرپور، کوٹلی، کھوئی رٹہ، نکیال، پلندری اور مظفر آباد کے کیمپ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کیمپوں میں ۲۵ ستمبر سے لے کر ۲۸ فروری تک مہاجرین کو بنیادی ضروریات کی جو مختلف اشیاء فراہم کی جاتی رہیں ان کی کچھ تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

قرآن حکیم	۱۶۴۹
لحاف	۱۰،۳۳۵
توشکیں	۴،۹۶۴
دریاں اور کھیس	۷،۹۵۴
کمبل	۱۲۰۲
کپڑے زنانہ و مردانہ	۲،۰۸،۱۵۶
بچوں کے لیے کپڑے	۲۲۷۷۹
کوٹ	۱۶۵۸۳
جرسیاں	۵۷۹۸

جُوتوں کے جوڑے	۸۷۰۳
برتن	۴۱۷۴۸
نیا کپڑا	۹۶۷۴ گز
بُرقعے	۷۹
لالٹینیں	۱۶۴
گرائپ واٹر	۲۸۰ بوتلیں
بسکٹ	۱۰۰ پیکٹ
تیل سرسوں	۲ من ۳۰ سیر
گندم، چاول	۱۲۷۲ من ۱۵ سیر
دیگر اشیاء	۲۰۹۵۰

یہ اور اسی طرح کی دوسری اشیاء ایک بندھے منصوبے اور پوری احساسِ ذمہ داری کے ساتھ مہاجرین میں اُن کی ضروریات کے مطابق تقسیم ہوتی رہیں تا آنکہ ۱۲ جنوری تک شاید ہی کوئی ایسا مہاجر باقی رہ گیا تھا جسے اس کی ضرورت کی کوئی نہ کوئی چیز فراہم نہ کردی گئی ہو۔

اس کام کے دوران میں یہ بات شدّت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ شہداء کے ورثاء بڑے دکھی ہیں اور خصوصی اعانت کے مستحق ہیں۔ اس لیے انہیں راولپنڈی اور باغ میں خاص اہتمام کے تحت سامان دیا گیا۔ پھر جو لوگ اپنی بچیوں کے نکاح کے لیے فکرمند تھے مگر وسائل نہ ہونے کی وجہ اس فریضہ کو ادا کرنے میں متامل نظر آتے تھے انہیں مناسب سامانِ جہیز مہیا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس طرح کئی بچیاں گھروں میں آباد ہوگئیں۔ جن یتیم بچوں اور بچیوں، بیوگان اور طلبا کو مالی امداد کی ضرورت محسوس ہوئی انہیں یہ امداد پوری فراخدلی سے بہم پہنچائی گئی۔ اور جو طلبا اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے خواہشمند نظر

آئے انہیں نصاب کی کتب مہیا کی گئیں۔ جب کبھی مہاجرین کو کیمپوں میں کسی قسم کی کوئی دشواری اور دقت محسوس ہوئی، اسے حتی الامکان اپنے وسائل سے دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور اگر اس کا ازالہ سرکاری افسروں کے تعاون کے بغیر ممکن نہ ہوا تو انہیں اس کی طرف توجہ دلائی گئی۔ یہ سخت ناانصافی ہو گی اگر ہم حکومت آزاد کشمیر کے ملازمین کے احساسِ ذمہ داری کی داد نہ دیں۔ انہوں نے مہاجرین کی خدمت میں جس دلسوزی اور ہمدردی کا ثبوت دیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے اور جماعت خاص طور پر اس لیے ان کی شکر گزار ہے کہ اُن کے جذبۂ تعاون کی بدولت ہمارے کارکن مختلف کیمپوں میں پوری یکسوئی اور طمانیتِ خاطر کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

مہاجرین کو ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی نے جس دوسرے کام کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی وہ اُن کی صحت کی حفاظت تھی۔ بدحال اور مضمحل لوگ یُوں بھی ہر وقت بیماریوں کی زد میں رہتے ہیں، لیکن جب اسی قسم کے بے کس افراد کے ہجوم مختلف مقامات پر جمع ہو جائیں تو اُن کے اندر اکثر اوقات خطرناک قسم کی وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ چنانچہ جماعت اسلامی نے اس ضروری کام کے لیے ضلع میرپور میں چار مقامات پر (میرپور، نکیال، کھوئی رٹہ، اور کوٹلی) اور ضلع پونچھ میں رہڑہ، باغ، ہجیرہ اور نزڑ کھیل میں متعدد شفا خانے قائم کیے۔ ان شفا خانوں میں سے بیشتر نے وسط نومبر سے اپنے کام کا آغاز کیا اور چند مہینے مسلسل ضرورتمند لوگوں کو طبی امداد بہم پہنچانے کے بعد اب مئی کے آخر میں اس کام کو ختم کیا ہے۔ ان آٹھ عمومی شفا خانوں کے علاوہ ایک مقام پر دانتوں کے امراض کے لیے ایک الگ ڈسپنسری بھی قائم کی گئی تاکہ جس شخص کو اس معاملے میں کسی ماہرِ فن کی خدمت درکار ہو وہ اس کی طرف رجوع کر سکے۔ ان شفا خانوں سے مجموعی طور پر اس مدت میں دو لاکھ تین ہزار، تین سو چھ (۲۰۳۳۰۶) مریضوں نے استفادہ کیا ہے۔

صحت کے ان مراکز میں اگرچہ زیادہ تر توجہ مریضوں کو طبی امداد پہنچانے پر مرکوز کی گئی تھی لیکن اس خدمت کے ساتھ ساتھ ان میں مہاجرین کی دیگر مشکلات کو بھی حتی الوسع دُور کرنے کی کوشش کی گئی اور جماعت کے کارکنوں نے ان مراکز سے ضرورت مندوں اور محتاجوں کو اشیائے ضرورت بہم پہنچانے کا بھی انتظام کیا۔ مہاجرین کے اندر جو سامان تقسیم ہُوا ہے اس کا پچیس فیصد ان ڈسپنسریوں کی وساطت سے اُن تک پہنچایا گیا ہے۔ جماعت کے کارکنوں نے اس پُورے کام کو کرتے وقت ایک چیز کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا ہے کہ اپنے سارے وسائل اور اپنی پُوری قوتوں کو ان دُکھی افراد کی خدمت اور دستگیری میں صرف کیا جائے اور ضابطے کی پابندیوں کو اس راہ میں کم سے کم حائل ہونے دیا جائے۔ اگر کسی مریض نے طبی امداد کے لیے شفاخانے کا رُخ کیا اور کارکنوں نے دیکھا کہ وہ ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم ہے تو انہوں نے اُس کے علاج کی فکر کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے اشیائے ضرورت بھی بہم پہنچانے کی کوشش کی اور جہاں کسی کو مالی امداد کا مستحق سمجھا گیا وہاں روپے سے بھی اُس کی امداد کی گئی۔

ہمارے کارکنوں نے اشیاء اور ادویہ تقسیم کرتے وقت اس بات کا پورا پورا اہتمام کیا کہ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں مستحقین تک پہنچیں اور اس معاملے میں کافی تلاش و جستجو سے کام لیا گیا۔ لیکن ایک چیز کا ہمیشہ خیال رکھا گیا کہ اس چھان بین میں کسی ضرورتمند کی عزتِ نفس قصداً مجروح نہ ہونے پائے۔ جماعت کے کارکنوں کی عام پالیسی یہ تھی کہ جس فرد نے بھی اپنی کسی احتیاج کا اظہار کیا اُسے کسی نہ کسی طرح پُورا کرنے کی کوشش کی گئی اور ممکن حد تک اس امر کا التزام کیا گیا کہ اُس کے اندر کسی طرح محرومی کا احساس نہ پیدا ہو کیونکہ اس احساس کے اُبھرنے سے بہت سی اخلاقی اور نفسیاتی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ احساس لاشعور میں پہنچ کر انسان کی قوتِ ارادی پر کاری ضرب لگاتا ہے اور اس کے حوصلوں اور عزائم کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔ پھر اس سے انسان ایک تو اپنے آپ پر اعتماد کھو دیتا ہے اور دوسرے وہ باہر کی ساری دنیا کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔

اُس کا کسی فرد یا گروہ پر اعتماد باقی نہیں رہتا۔ اُس کے اندر چڑ اور ضد اور قنوطیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ معمولی معمولی بات پر لوگوں سے اُلجھنے لگتا ہے اور ہر اچھے سے اچھے کام کی راہ میں حائل ہونا اور اُس کی اہمیت اور وزن کو کم کرنا اور اُس میں خواہ مخواہ کیڑے نکالنا اپنی زندگی کا مشن بنا لیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اُس نے ہمارے کارکنوں کو اتنی فراست اور حوصلہ دیا کہ انہوں نے مفلوک الحال مہاجرین کو، جن میں اس مرض کے پھیلنے کے ہر قدم پر مواقع موجود تھے، اس روگ سے بچانے کی کامیاب کوشش کی اور کسی ایک شخص کے اندر بھی اسے راہ پانے کا موقع نہ دیا۔ جماعت کے کارکنوں نے مختلف کیمپوں میں کئی ماہ تک کام کیا ہے لیکن باری تعالیٰ کا فضل ہے کہ کسی ایک فرد کی طرف سے بھی کسی نا انصافی، زیادتی یا غیر ہمدردانہ سلوک کی شکایت سننے میں نہیں آئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاجرین کے حوصلے شروع سے لے کر آخر تک بلند رہے، اُن کے پائے استقلال میں کسی مرحلہ پر بھی کوئی لغزش نہ پیدا ہونے پائی اور جن اچھی توقعات کے ساتھ انہوں نے آزاد کشمیر میں پناہ لی تھی وہ جوں کی توں قائم رہیں۔ خون کے پیاسے ظالم و غاصب دشمنوں اور جاں نثار مخلص بھائیوں کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں جو بنیادی اور عظیم فرق ہوتا ہے اُس کا انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا اور ہمیں یقین ہے کہ یہ چیز کشمیر کی تحریکِ آزادی کے لیے انشاء اللہ بڑی مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ اگر خدانخواستہ ان مہاجرین کو اس پناہ گاہ میں ہمدردی و محبت کا سلوک نہ ملتا اور انہیں یہاں بھی شقاوت و سنگدلی سے سابقہ پیش آتا، جس کی توقع ظاہر ہے کہ وہ پاکستان سے نہ رکھتے تھے، تو اس سے تحریکِ آزادی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آزاد کشمیر کے باشندوں نے ان کے ساتھ بھائیوں سے بڑھ کر سلوک کیا اور مختلف کیمپوں میں کام کرنے والے کارکنوں نے، جن کا زیادہ تر تعلق جماعت اسلامی سے تھا اپنے ان مصیبت زدہ عزیزوں کی ایسے اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ خدمت کی کہ اس کے نقش انشاء اللہ تا حینِ حیات اُن کے

دلوں پر قائم رہیں گے ۔

جماعت اسلامی کی اس معاونت سے حکومت آزاد کشمیر کا بوجھ کافی حد تک ہلکا ہو گیا اور وہ مہاجرین کی خبر گیری سے بے فکر ہو کر اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ ریاست کی دفاعی سرگرمیوں کی طرف مبذول کر سکی ۔ اس حقیقت کا اعتراف ریاست کے معمولی کارکن سے لیکر اس کے صدر زنک نے کیا ہے ۔ جناب عبدالحمید خاں صاحب نے محترم صدیق الحسن صاحب گیلانی ناظم میڈیکل یونٹس کو ایک خط میں تحریر فرمایا ہے :

"میں جماعت اسلامی پاکستان کا طبی امداد کے لیے جو اس کی طرف سے مہاجرین جموں و کشمیر کو بہم پہنچائی گئی شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کار خیر کے لیے کارکن حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے ۔" آمین

اسی طرح حکومت آزاد کشمیر کے سیکرٹری صاحب نے یہ نوازش نامہ لکھا ہے :

"جماعت اسلامی نے اس بے پناہ مصیبت اور ابتلاء کے دور میں جبکہ بھارت کے ساتھ حق و باطل کی وہ جنگ برپا تھی جو مجاہدین کشمیر نے بہ توفیق الٰہی شروع کی ہے اور اب بھی جاری ہے ، جس خلوص و ایثار اور بے پناہ ہمدردی اور دردمندی کا مظاہرہ کیا وہ اس عظیم منظم دینی جماعت سے متوقع تو تھا ہی لیکن میں صدر حکومت آزاد و جموں و کشمیر کی طرف سے اس کام کے لیے جماعت اسلامی کا شکریہ تحریری طور پر ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔ صدر حکومت آزاد جموں و کشمیر نے شکریہ کا خط براہِ راست امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے نام بھی تحریر کیا ہے لیکن انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں وفد کی تکلیف کے لیے بھی جماعت کا شکریہ ادا کروں اور ساتھ ہی مزید اعانت و امداد کی اپیل بھی کروں ۔ مہاجرین کی ضروریات جن کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے ، مندرجۂ ذیل ہیں :۔

(اشیاء کی فہرست درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں)

"امید ہے کہ جماعتِ اسلامی پاکستان اپنی مساعی جمیلہ میں آئندہ بھی کمی نہیں کرے گی اور جب تک کشمیر غاصب بھارت کے چنگل سے آزاد ہو کر پاکستان کے ساتھ ملحق نہیں ہو جاتا، ہماری ہر ابتلا اور آزمائش میں ہمارے ساتھ حسبِ سابق تعاون کرے گی۔ خدا آپ کو اور ہم کو اس نازک موقع پر ملتِ اسلامیہ کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق دے۔ آمین"

جماعت اسلامی نے صرف مہاجرین کے معاملہ ہی میں حکومتِ آزاد کشمیر کا ہاتھ بٹانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جہاد کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپیہ نقد بھی اس کو ادا کیا۔

آزاد کشمیر کے مختلف کیمپوں میں کام کرتے ہوئے یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ان مظلوم مہاجرین کو زندگی کی ضروریات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس مصیبت کے وقت تسلّی اور تشفی کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے رفقاء جہاں جہاں کام کرتے رہے انہوں نے اس اہم مسئلہ کی طرف بھی پوری توجہ کی۔ ایک ایک ستم زدہ کے پاس جا کر اس کی ڈھارس بندھائی، اُس کے جذبۂ ایمانی کو بیدار کیا، اُسے اپنے خالق و مالک کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی اور مہاجرین کے اندر اس یقین کو راسخ کیا گیا کہ وہ ایک عظیم اور مقدس مقصد کی خاطر یہ سارے مصائب برداشت کر رہے ہیں اور باری تعالیٰ اُن کی ان قربانیوں کو کبھی رائگاں نہیں جانے دیگا۔ ظلم و استبداد بالآخر مٹ کر رہے گا اور جو درندے اُن پر یلغار کر رہے ہیں وہ جلد ہی اپنی ان حرکات کا انجام دیکھیں گے۔

اگرچہ جماعت کے کارکن یہ کام پورے انہماک کے ساتھ سرانجام دے رہے تھے لیکن اس کے باوجود لوگوں کے اندر اس بات کی شدید خواہش تھی کہ جماعت اسلامی کے سربراہ خود آکر ان کی دردانگیز داستانیں سنیں اور ان کے زخموں پر خود اپنے ہاتھوں

سے مرہم رکھیں۔ چنانچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے شدید مصروفیات اور نازک ذمہ داریوں کے ہجوم میں گھرے ہونے کے باوجود اس اہم کام کے لیے وقت نکالا اور میاں طفیل محمد صاحب (امیر جماعت اسلامی مغربی پاکستان)، جناب نعیم صدیقی صاحب (سیکرٹری شعبۂ نشرواشاعت) جناب صدیق الحسن گیلانی، جناب اسعد گیلانی (امیر جماعت اسلامی علاقہ سرگودھا) اور جناب خلیل حامدی (ناظم دارالعروبہ) کی معیت میں آزاد کشمیر کا دورہ کیا اور مہاجرین کے پاس پہنچ کر نہ صرف ان پر ڈھائے گئے مظالم کی داستانیں سنیں اور ان کی حالتِ زار کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے اور ان کی مشکلات کا جائزہ لے کر ان کی معاونت اور دستگیری کی متعدد تدابیر سوچیں بلکہ ان دکھی لوگوں کو خود تسلی دی اور انہیں اس امر کا یقین دلایا کہ آزاد کشمیر اور پاکستان کے مسلمان ہی نہیں، پوری دنیائے اسلام کے لوگ ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور وہ انہیں ہر قسم کی امداد دینے پر آمادہ ہیں۔ ان پر آشوب حالات میں مولانا اور جماعت اسلامی کے دوسرے سربراہوں کی زبان سے تسلی و تشفی کے الفاظ ان مظلوموں کی ڈھارس بندھانے میں جس قدر موثر ثابت ہوئے اُس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہیں ان کیمپوں میں خود کام کرنے کا موقع ملا ہے۔

امیر جماعت اسلامی نے اس سفر سے واپسی پر راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس بلائی اور اخبارات کے ذریعے سے ملک کے لوگوں کو کشمیری بھائیوں کی حالتِ زار سے آگاہ کیا۔ اس کانفرنس میں مولانا نے نہ صرف قوم کے احساسات کو اچھی طرح بیدار کیا بلکہ انسانیت کے ضمیر کو بھی جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پہلے سے بھی کہیں زیادہ جوش و خروش اور مستعدی کے ساتھ مہاجرین کی امداد کے لیے آگے بڑھے۔ پھر ملک کے باہر دنیا کے مسلمانوں تک جب مولانا کی زبان سے ان روح فرسا مظالم کی داستان پہنچی جو امن و سلامتی کے مدعیوں نے کشمیر کے نہتے مسلمانوں پر ڈھائے ہیں، تو ان کو پہلی مرتبہ کشمیر کی

حقیقی صورتِ حال اور ہندوستان کی حکومت کے اصلی خدوخال کا علم ہوا اور اس نے عالمِ اسلامی کی رائے عام پر بڑا اثر ڈالا مختلف اسلامی ممالک کے با اثر لوگوں اور اخبارات نے ان موثوق اطلاعات کی بنا پر بھارت کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کیا اور مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی مظلومیت اور اس ریاست کے معاملے میں پاکستان کے موقف کی صحت کی ہر جگہ وکالت کی۔

یہاں ہم اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جماعت کے کارکنوں نے اگرچہ زیادہ تر توجہ آزاد کشمیر کے مہاجرین کی خدمت پر صرف کی لیکن ضرورت مندوں کی معاونت میں انہوں نے علاقائی حدبندیوں کو اپنی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے جب کبھی یہ دیکھا کہ آزاد کشمیر کے کیمپوں سے سامان اور نقدی کا کچھ حصہ بالکل جائز طور پر بچا کر پاکستان کے سرحدی علاقوں کے اجڑے ہوئے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے صرف کیا جا سکتا ہے تو جس علاقے سے بھی ان کے پاس مانگ آئی انہوں نے فوراً وہاں امدادی سامان پہنچا دیا۔ اس سلسلہ میں امیر جماعت اسلامی سیالکوٹ کو مجموعی طور پر ساڑھے نو ٹرک سامان بھیجا گیا جس میں سے آٹھ ٹرک سیالکوٹ کے مہاجرین میں، ایک ٹرک بھوپال والا کے مہاجرین اور نصف ٹرک سوہاوہ ضلع جہلم کے مہاجرین میں تقسیم ہوا۔

جماعت اسلامی نے اگرچہ آزاد کشمیر سے اب اپنے کیمپوں کو اٹھا لیا ہے لیکن دوسرے علاقوں کے مہاجرین کی خدمت کے لیے اس کی سرگرمیاں بدستور جاری ہیں۔ اس کے شفاخانے اور خدمت کے دوسرے شعبے اب لاہور اور سیالکوٹ کے سرحدی علاقوں میں پوری طرح سرگرم عمل ہیں۔ لاہور میں یہ شفاخانے جلو موڑ، منہالہ اور برکی میں قائم ہیں اور ان جنگی بے گھروں کو جو خانہ ویرانی کے بعد اب پھر اپنے علاقوں میں آباد ہونے کے لیے

کوشاں ہیں، مفت طبی امداد مہیا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کے کارکن ان بستیوں کی منہدم شدہ مساجد کو از سرِ نو تعمیر کر کے انہیں آباد کرنے اور دیہاتی آبادیوں کے لیے پانی کا خاطر خواہ انتظام کرنے میں اس علاقے کے لوگوں کی ہر طرح معاونت کر رہے ہیں۔

یہ گزارشات ختم کرنے سے پہلے ہم آزاد کشمیر کے مہاجرین کے متعلق دو باتوں کا تذکرہ نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس ملک کے عوام اور اربابِ اختیار ان کی طرف خصوصی توجہ دیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مہاجرین کو اسلام سے بڑی گہری وابستگی ہے اور اسی وابستگی نے شدید مصائب سے دوچار ہونے کے باوجود اُن کے حوصلوں کو بلند رکھا ہے اور انہیں مضمحل نہیں ہونے دیا، لیکن اسلام کے ساتھ یہ سراسر جذباتی لگاؤ جس میں شعور کا معمولی عمل دخل بھی نہ ہو، انتہائی صبر آزما حالات میں ایک لمبی مدت تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر بالفرض یہ بھی مان لیا جائے کہ موجودہ نسل کے اندر اسلام سے محبت جوں کی توں قائم رہے گی تو اس بات کی قطعاً کوئی ضمانت نہیں کہ نئی نسل، جو نئے ماحول اور نئے حالات کی پیداوار ہوگی وہ بھی دینِ حق کے ساتھ اس وابستگی کا مظاہرہ کرے گی جس کا اظہار آج ہو رہا ہے۔ جذبات کے شعلے جتنی تیزی کے ساتھ بھڑکتے ہیں اُسی سرعت کے سرد بھی پڑ جاتے ہیں اور انہیں غیر شعوری قوتوں کے بل بوتے پر زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ کشمیر کے مہاجرین میں دینی تعلیم کا سخت فقدان ہے اور وہ دین کی بالکل ابتدائی تعلیمات تک سے ناواقف ہیں۔ نماز، روزے کی پابندی، قرآن حکیم کی تلاوت، اور موٹے موٹے فقہی مسائل سے واقفیت تو خیر بڑی باتیں ہیں، ان مہاجرین میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اسلام کے اُس اساسی کلمہ تک سے ناواقف ہے جس کی بنیاد پر ایک شخص مسلمان ہوتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ان لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے

وہ فضیلت بہم پہنچانے کی فکر کرنی چاہیے ۔کیونکہ اگر ان کے اندر اسلام کا صحیح شعور پیدا نہ ہوا تو وہ اپنے اُس غیر معمولی امتیاز کی صحیح قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر رہیں گے جو انہیں غیر مسلموں پر حاصل ہے اور اگر اس طرف پوری توجہ نہ دی گئی تو اس بات کا ہر وقت خطرہ موجود ہے کہ اُن کی آنے والی نسلیں دینی نقطۂ نظر سے راکھ کا ڈھیر بن کر نہ رہ جائیں جسے مفادات کے تھپیڑے جس طرف چاہیں بڑی آسانی کے ساتھ اڑا کر لے جائیں ۔

دوسرے ان لوگوں کا طویل مدت تک کیمپوں میں بے کار پڑے رہنا نہ اُن کے لیے مفید ہے اور نہ حکومت کے لیے ۔حکومت کو انہیں کسی مفید کام پر لگانے کی فکر کرنی چاہیے ۔ اور ان کی صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانا چاہیے ۔ ہمارے کارکنوں کا اندازہ ہے کہ خود مہاجرین کے اندر بھی یہ احساس پُوری شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے ۔ وہ خود چاہتے ہیں کہ انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی بیکار نہ رہنے دیا جائے وہ اس بات کے بھی آرزو مند ہیں کہ انہیں فوجی تربیت دی جائے تاکہ وہ بھارتی جارحیت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں ۔اگر اُن کی یہ آرزو بطریق احسن پُوری ہو جائے تو اس سے نہ صرف ان لوگوں کے عزائم بلند رہیں گے بلکہ ان کے اندر محنت و مشقت کی عادت بھی بدستور قائم رہے گی اور وہ ملکی دفاع اور بحالی میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دینے کے قابل ہوں گے ۔

اس ملک میں دین و شریعت کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا جا رہا ہے ۔وہ کوئی ڈھکی چھپی داستان نہیں ۔ہر شخص جو تھوڑی سی دینی بصیرت بھی رکھتا ہے ۔وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے ۔یہاں سرکاری خرچ پر متعدد ایسے ادارے چلائے جا رہے ہیں جو دین کا حلیہ بگاڑنے میں پوری طرح مصروف ہیں ان اداروں میں تجدد پسندوں کی فوج بھرتی کی گئی ہے جو ہر وقت اسلام کے نظام حیات پر یلغار

(باقی ص ۶۹ پر)

تفہیم القرآن

الحُجُرات

(۲)

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے

۱۹؎ پچھلی دو آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی لڑائی کے متعلق ضروری ہدایات دینے کے بعد اہل ایمان کو یہ احساس دلایا گیا تھا کہ دین کے مقدس ترین رشتے کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ان کو خدا سے ڈرتے ہوئے اپنے آپس کے تعلقات کو درست رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب آگے کی دو آیتوں میں اُن بڑی بڑی برائیوں کے سدباب کا حکم دیا جا رہا ہے جو بالعموم ایک معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت پر حملہ، ایک دوسرے کی دل آزاری، ایک دوسرے سے بدگمانی، اور ایک دوسرے کے عیوب کا تجسس، درحقیقت یہی وہ اسباب ہیں جن سے آپس کی عداوتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر دوسرے اسباب کے ساتھ مل کر ان سے بڑے بڑے فتنے رُونما ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو احکام آگے کی آیتوں میں دیئے گئے ہیں اور ان کی جو تشریحات احادیث میں ملتی ہیں ان کی بنا پر ایک اسلامی حکومت کے قانونِ ہتکِ عزت (LAW OF BIBEL) کی تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔ مغربی قوانینِ ہتکِ عزت اس معاملے میں اتنے ناقص ہیں کہ ایک شخص ان کے تحت دعویٰ کر کے اپنی عزت کچھ اور کھو آتا ہے۔ اسلامی قانون اس کے برعکس ہر شخص کی ایک بنیادی عزت کا قائل ہے جس پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے قطع نظر اس سے کہ حملہ واقعیت پر مبنی ہو یا نہ ہو، اور جس پر حملہ کیا گیا ہے اس کی کوئی "حیثیتِ عرفی" ہو یا نہ ہو۔ مجرد یہ بات

بہتر ہوں۔[۲۰] آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو[۲۱] اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے

کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کی تذلیل کی ہے اسے مجرم بنا دینے کے لیے کافی ہے، الّا یہ کہ اس تذلیل کا کوئی شرعی جواز ثابت کر دیا جائے۔

۲۰؎ مذاق اڑانے سے مراد محض زبان ہی سے کسی کا مذاق اڑانا نہیں ہے، بلکہ کسی کی نقل اتارنا اس کی طرف اشارے کرنا، اس کی بات پر یا اس کے کام یا اس کی صورت یا اس کے لباس پر ہنسنا، یا اس کے کسی نقص یا عیب کی طرف لوگوں کو اس طرح توجہ دلانا کہ دوسرے اس پر ہنسیں، یہ سب بھی مذاق اڑانے میں داخل ہیں۔ اصل ممانعت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی کسی نہ کسی طور پر تضحیک کرے، کیونکہ اس تضحیک میں لازماً اپنی بڑائی اور دوسرے کی تذلیل و تحقیر کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں جو اخلاقاً سخت معیوب ہیں، اور مزید برآں اس سے دوسرے کی دل آزاری بھی ہوتی ہے جس سے معاشرے میں فساد رونما ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس فعل کو حرام کیا گیا ہے۔

مردوں اور عورتوں کا الگ الگ ذکر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے لیے عورتوں کا مذاق اڑانا یا عورتوں کے لیے مردوں کا مذاق اڑانا جائز ہے۔ دراصل جس وجہ سے دونوں کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام سرے سے مخلوط سوسائٹی ہی کا قائل نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی تضحیک عموماً بے تکلف مجلسوں میں ہوا کرتی ہے، اور اسلام میں یہ گنجائش رکھی ہی نہیں گئی ہے کہ غیر محرم مرد اور عورتیں کسی مجلس میں جمع ہو کر آپس میں ہنسی مذاق کریں۔ اس لیے اس بات کو ایک مسلم معاشرے میں قابلِ تصور نہیں سمجھا گیا ہے کہ ایک مجلس میں مرد کسی عورت کا مذاق اڑائیں گے یا عورتیں کسی مرد کا مذاق اڑائیں گی۔

۲۱؎ اصل میں لفظ لَمز استعمال ہوا ہے جس کے اندر طعن و تشنیع کے علاوہ متعدد دوسرے مفہومات بھی شامل ہیں، مثلاً چوٹیں کرنا، پھبتیاں کسنا، الزام دھرنا، اعتراض جڑنا، عیب چینی کرنا، اور کھلم کھلا یا زیرِ لب یا اشاروں سے کسی کو نشانۂ ملامت بنانا۔ یہ سب افعال بھی چونکہ آپس کے

یاد کرو۔[۲۲] ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بُری بات ہے[۲۳]۔ جو لوگ اس روش

تعلقات کو بگاڑتے اور معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں اس لیے ان کو حرام کر دیا گیا ہے۔ کلامِ الٰہی کی بلاغت یہ ہے کہ لَا یَلْمِزْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (ایک دوسرے پر طعن نہ کرو) کہنے کے بجائے لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنے اوپر طعن نہ کرو) کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں جن سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرنے والا دراصل خود اپنے آپ کو مطعون کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کی زبان دوسروں کے خلاف بدگوئی کے لیے اس وقت تک نہیں کھلتی جب تک اس کے دل میں برے جذبات کا لاوا خوب پک کر پھوٹ پڑنے کے لیے تیار نہ ہو گیا ہو۔ اس طرح ان جذبات کی پرورش کرنے والا دوسروں سے پہلے اپنے نفس کو تو بدی کا آشیانہ بنا چکتا ہے۔ پھر جب وہ دوسروں پر چوٹ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنے اوپر چوٹیں کرنے کے لیے دوسروں کو دعوت دے رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اپنی شرافت کی بنا پر اس کے حملوں کو ٹال جائے۔ مگر اس نے تو اپنی طرف سے یہ دروازہ کھول ہی دیا کہ وہ شخص بھی اس پر حملہ آور ہو۔ جس کو اس نے اپنی زبان کے تیروں کا ہدف بنایا ہے۔

[۲۳] اس حکم کا منشا یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسے نام سے نہ پکارا جائے یا ایسا لقب نہ دیا جائے جو اس کو ناگوار ہو اور جس سے اس کی تحقیر و تنقیص ہوتی ہو۔ مثلاً کسی کو فاسق یا منافق کہنا۔ کسی کو لنگڑا یا اندھا یا کانا کہنا۔ کسی کو اس کے اپنے یا اس کی ماں یا باپ یا خاندان کے کسی عیب یا نقص سے ملقب کرنا۔ کسی کو مسلمان ہو جانے کے بعد اس کے سابق مذہب کی بنا پر یہودی یا نصرانی کہنا۔ کسی شخص یا خاندان یا برادری یا گروہ کا ایسا نام رکھ دینا جو اس کی مذمت اور تذلیل کا پہلو رکھتا ہو۔ اس حکم سے صرف وہ القاب مستثنیٰ ہیں جو اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے تو بدنما ہیں مگر ان سے مذمت مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ ان لوگوں کی پہچان کا ذریعہ بن جاتے ہیں جن کو ان القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر محدثین نے اسماء الرجال میں سلیمان الاعمش (چندھے سلیمان) اور واصل الاحدب (کبڑے واصل) جیسے القاب کو جائز رکھا ہے۔ ایک نام کے کئی آدمی موجود ہوں اور ان میں سے

سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں[۲۴]۔ تجسس نہ کرو[۲۵]۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے[۲۶]۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا

کسی خاص شخص کی پہچان اُس کے کسی خاص لقب ہی سے ہوتی ہو تو وہ لقب استعمال کیا جا سکتا ہے اگرچہ وہ بجائے خود بُرا ہو۔ مثلاً عبداللہ نام کے کئی آدمی ہوں اور ایک ان میں سے نابینا ہو تو آپ اس کی پہچان کے لیے نابینا عبداللہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے القاب بھی اس حکم کے تحت نہیں آتے جن میں بظاہر تنقیص کا پہلو نکلتا ہے مگر درحقیقت وہ محبت کی بنا پر رکھے جاتے ہیں اور خود وہ لوگ بھی جنہیں ان القاب سے یاد کیا جاتا ہے، انہیں پسند کرتے ہیں جیسے ابوہریرہؓ اور ابوترابؓ۔

۲۳؎ یعنی ایک مؤمن کے لیے یہ بات سخت شرمناک ہے کہ مؤمن ہونے کے باوجود وہ بدزبانی اور شہدپن میں نام پیدا کرے۔ ایک کافر اگر اس لحاظ سے مشہور ہو کہ وہ لوگوں کا مذاق خوب اُڑاتا ہے، یا پھبتیاں خوب کستا ہے، یا بُرے بُرے نام خوب تجویز کرتا ہے، تو یہ انسانیت کے لحاظ سے خواہ اچھی شہرت نہ ہو کم ازکم اس کے کفر کو تو زیب دیتی ہے۔ مگر ایک آدمی اللہ اور اس کے رسول اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد ایسے ذلیل اوصاف میں شہرت حاصل کرے تو یہ ڈوب مرنے کے لائق بات ہے۔

۲۴؎ مطلقاً گمان کرنے سے نہیں روکا گیا ہے بلکہ بہت زیادہ گمان سے کام لینے اور ہر طرح کے گمان کی پیروی کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اس حکم کو سمجھنے کے لیے ہمیں تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ گمان کی کتنی قسمیں ہیں اور ہر ایک کی اخلاقی حیثیت کیا ہے۔

ایک قسم کا گمان وہ ہے جو اخلاق کی نگاہ میں نہایت پسندیدہ اور دین کی نظر میں مطلوب اور محمود ہے مثلاً اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان سے نیک گمان اور ان لوگوں کے ساتھ حسنِ ظن جن سے آدمی کا میل جول ہو اور جن کے متعلق بدگمانی کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔

دوسری قسم کا گمان وہ ہے جس سے کام لینے کے سوا عملی زندگی میں کوئی چارہ نہیں ہے، مثلاً عدالت میں

اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا کہ جو شہادتیں حاکمِ عدالت کے سامنے پیش ہوں ان کو جانچ کر وہ غالب گمان کی بنا پر فیصلہ کرے، کیونکہ معاملہ کی حقیقت کا براہِ راست علم اس کو نہیں ہو سکتا، اور شہادتوں کی بنیاد پر جو رائے قائم ہوتی ہے وہ زیادہ تر یقین پر نہیں بلکہ ظنِ غالب پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی طرح بکثرت معاملات میں، جہاں کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور حقیقت کا علم حاصل ہونا ممکن نہیں ہوتا، انسان کے لیے گمان کی بنیاد پر ایک رائے قائم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

گمان کی ایک تیسری قسم وہ ہے جو اگرچہ ہے تو بدگمانی، مگر جائز نوعیت کی ہے اور اس کا شمار گناہ میں نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کی سیرت و کردار میں یا اس کے معاملات اور طور طریقوں میں ایسی واضح علامات پائی جاتی ہوں جن کی بنا پر وہ حسنِ ظن کا مستحق نہ ہو اور اس سے بدگمانی کرنے کے لیے معقول وجوہ موجود ہوں۔ ایسی حالت میں شریعت کا مطالبہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ آدمی سادہ لوحی برت کر ضرور اس سے حسنِ ظن ہی رکھے۔ لیکن اس جائز بدگمانی کی آخری حد یہ ہے کہ اس کے امکانی شر سے بچنے کے لیے بس احتیاط سے کام لینے پر اکتفا کیا جائے۔ اس سے آگے بڑھ کر محض گمان کی بنا پر اس کے خلاف کوئی کارروائی کر بیٹھنا درست نہیں ہے۔

چوتھی قسم کا گمان جو درحقیقت گناہ ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کسی شخص سے بلا سبب بدگمانی کرے، یا دوسروں کے متعلق رائے قائم کرنے میں ہمیشہ بدگمانی ہی سے ابتدا کیا کرے، یا ایسے لوگوں کے معاملہ میں بدظنی سے کام لے جن کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ نیک اور شریف ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی گناہ ہے کہ ایک شخص کے کسی قول یا فعل میں برائی اور بھلائی کا یکساں احتمال ہو اور ہم محض سوءِ ظن سے کام لے کر اس کو برائی ہی پر محمول کریں۔ مثلاً کوئی بھلا آدمی کسی محفل سے اٹھتے ہوئے اپنے جوتے کے بجائے کسی اور کا جوتا اٹھا لے اور ہم یہ رائے قائم کر لیں کہ ضرور اس نے جوتا چرانے ہی کی نیت سے یہ حرکت کی ہے، حالانکہ یہ فعل بھولے سے بھی ہو سکتا ہے اور اچھے احتمال کو چھوڑ کر برے احتمال کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ بدگمانی کے سوا نہیں ہے۔

اس تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گمان بجائے خود کوئی ممنوع چیز نہیں ہے، بلکہ بعض حالات میں وہ پسندیدہ ہے، بعض حالات میں ناگزیر ہے، بعض حالات میں ایک حد تک جائز اور اس سے آگے ناجائز ہے، اور بعض حالات میں بالکل ہی ناجائز ہے۔ اسی بنا پر یہ نہیں فرمایا گیا کہ گمان سے یا بدگمانی سے مطلقاً پرہیز کرو، بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ بہت زیادہ گمان کرنے سے پرہیز کرو۔ پھر حکم کا منشا واضح کرنے کے لیے مزید بات یہ فرمائی گئی ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اس تنبیہ سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کبھی آدمی گمان کی بنا پر کوئی رائے قائم کر رہا ہو یا کسی اقدام کا فیصلہ کرنے لگے تو اسے اچھی طرح جانچ تول کر یہ دیکھ لینا چاہیے کہ میں جو گمان کر رہا ہوں کہیں وہ گناہ تو نہیں ہے؟ کیا فی الواقع اس گمان کی ضرورت ہے؟ کیا اس گمان کے لیے میرے پاس معقول وجوہ ہیں؟ کیا اس گمان کی بنا پر جو طرزِ عمل میں اختیار کر رہا ہوں وہ جائز ہے؟ یہ احتیاط لازماً ہر وہ شخص کرے گا جو خدا سے ڈرتا ہو۔ اپنے گمان کو مطلق العنان بنا کر رکھنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو خدا سے بے خوف اور آخرت کی بازپرس سے بے فکر ہیں۔

۲۵؎ یعنی لوگوں کے راز نہ ٹٹولو۔ ایک دوسرے کے عیب نہ تلاش کرو۔ دوسروں کے حالات اور معاملات کی ٹوہ نہ لگاتے پھرو۔ یہ حرکت خواہ بدگمانی کی بنا پر کی جائے، یا بدنیتی سے کسی کو نقصان پہنچانے کی خاطر کی جائے، یا محض اپنا استعجاب دُور کرنے کے لیے کی جائے، ہر حال میں شرعاً ممنوع ہے۔ ایک مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسروں کے جن حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے اُن کی کھوج کرید کرے اور پردے کے پیچھے جھانک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کس میں کیا عیب ہے اور کس کی کون سی کمزوریاں چھپی ہوئی ہیں۔ لوگوں کے نجی خطوط پڑھنا، دو آدمیوں کی باتیں کان لگا کر سننا، ہمسایوں کے گھر میں جھانکنا، اور مختلف طریقوں سے دوسروں کی خانگی زندگی یا ان کے ذاتی معاملات کی ٹٹول کرنا ایک بڑی بداخلاقی ہے جس سے طرح طرح کے فساد رونما ہوتے ہیں۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے خطبہ میں تجسّس کرنے والوں کے متعلق فرمایا:

یا معشر من آمن بلسانہ ولم یدخل الایمان قلبہ لا تتبعوا عورات المسلمین، فانہ من اتبع عوراتہم یتبع اللہ عورتہ ومن یتبع اللہ عورتہ یفضحہ فی بیتہ (ابوداؤد)

اے لوگو جو زبان سے ایمان لے آئے ہو مگر ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نہیں اترا ہے مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی کھوج نہ لگایا کرو، کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب ڈھونڈنے کے درپے ہوگا اللہ اس کے عیوب کے درپے ہو جائے گا اور اللہ جس کے درپے ہو جائے اسے اس کے گھر میں رسوا کر کے چھوڑتا ہے۔

حضرت معاویہ کہتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔

انک ان اتبعت عورات الناس افسدتہم او کدت ان تفسدہم (ابوداؤد)

تم اگر لوگوں کے مخفی حالات معلوم کرنے کے درپے ہوگے تو اُن کو بگاڑ دوگے یا کم از کم بگاڑ کے قریب پہنچا دوگے۔

ایک اور حدیث میں حضور کا ارشاد ہے:

اذا ظننتم فلا تحققوا (احکام القرآن للجصاص)

جب کسی شخص کے متعلق تمہیں کوئی بُرا گمان ہو جائے تو اس کی تحقیق نہ کرو۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

من رأی عورۃ فسترھا کان کمن احیا موؤدۃ (الجصاص)

جس نے کسی کا کوئی مخفی عیب دیکھ لیا اور اس پر پردہ ڈال دیا تو یہ ایسا ہے جیسے کسی نے ایک زندہ گاڑی ہوئی بچی کو موت سے بچا لیا۔

تجسس کی ممانعت کا یہ حکم صرف افراد ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ اسلامی حکومت کے لیے بھی ہے۔ شریعت نے نہی عن المنکر کا جو فریضہ حکومت کے سپرد کیا ہے اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ جاسوسی کا ایک نظام قائم کر کے لوگوں کی چھپی ہوئی برائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور ان پر سزا

دے، بلکہ اسے صرف اُن برائیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنی چاہیے جو ظاہر ہو جائیں ۔ رہیں مخفی خرابیاں تو ان کی اصلاح کا راستہ جاسوسی نہیں ہے بلکہ تعلیم، وعظ و تلقین، عوام کی اجتماعی تربیت، اور ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا ۔ آپ کو شک گزرا اور دیوار پر چڑھ گئے ۔ دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی ۔ آپ نے پکار کر کہا " اے دشمنِ خدا، کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کریگا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا ؟" اس نے جواب دیا " امیر المومنین جلدی نہ کیجیے ۔ اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کیے ہیں ۔ اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا ۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور آپ دیوار پر چڑھ کر آئے ۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اجازت لیے بغیر نہ جاؤ اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے " یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے اور اس کے خلاف انہوں نے کوئی کارروائی نہ کی، البتہ اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا ۔ (مکارم الاخلاق لابی بکر محمد بن جعفر الخرائطی) ۔ اس سے معلوم ہوا کہ افراد ہی کے لیے نہیں خود اسلامی حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے راز ٹٹول ٹٹول کر ان کے گناہوں کا پتہ چلائے اور پھر انہیں پکڑے ۔ یہی بات ایک حدیث میں بھی ارشاد ہوئی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم (ابوداؤد)

حکمران جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگے تو وہ ان کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ مخصوص حالات ہیں جن میں تجسس کی فی الحقیقت ضرورت ہو۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کے رویے میں بگاڑ کی کچھ علامات نمایاں نظر آ رہی ہوں اور اس کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا ہے تو حکومت اس کے حالات کی تحقیق کر سکتی ہے ۔ یا مثلاً کسی شخص کے ہاں کوئی شادی کا پیغام بھیجے، یا اس کے ساتھ کوئی کاروباری معاملہ کرنا چاہے تو وہ اپنے اطمینان کے لیے اس کے حالات کی تحقیق کر سکتا ہے

۲۶؎ غیبت کی تعریف یہ ہے کہ "آدمی کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہے جو اگر اسے معلوم ہو تو اس کو ناگوار گزرے"۔ یہ تعریف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت جسے مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے، اس میں حضورؐ نے غیبت کی یہ تعریف بیان فرمائی ہے:

ذکرك اخاك بما یکرہ۔ قیل افرأیت ان کان فی اخی ما اقول؟ قال ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہ وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتّہٗ۔	غیبت یہ ہے کہ "تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو"۔ عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو اس صورت میں آپ کا کیا خیال ہے؟ فرمایا اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہو تو تو نے اس کی غیبت کی، اور اگر اس میں وہ موجود نہ ہو تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔

ایک دوسری روایت جو امام مالک نے مؤطا میں حضرت مُطَّلِب بن عبداللہ سے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان رجلا سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما الغیبۃ؟ فقال ان تذکر من المرء ما یکرہ ان یسمع۔ قال یا رسول اللہ وان کان حقًّا؟ قال اذا قلت باطلًا فذالك البھتان	ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا غیبت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "یہ کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ وہ سنے تو اسے ناگوار ہو"۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اگرچہ میری بات حق ہو؟ آپ نے جواب دیا اگر تیری بات باطل ہو تو یہی چیز پھر بہتان ہے

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے خلاف اس کے پیچھے جھوٹا الزام لگانا بہتان ہے اور اس کے واقعی عیوب بیان کرنا غیبت۔ یہ فعل خواہ صریح الفاظ میں کیا جائے یا اشارہ و

کنایہ میں، بہرصورت حرام ہے۔ اسی طرح یہ فعل خواہ آدمی کی زندگی میں کیا جائے یا اس کے مرنے کے بعد، دونوں صورتوں میں اس کی حرمت یکساں ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ ماعز بن مالک اسلمی کو جب زنا کے جرم میں رجم کی سزا دے دی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ چلتے ایک صاحب کو اپنے دوسرے ساتھی سے یہ کہتے سُن لیا کہ "اِس شخص کو دیکھو، اللہ نے اس کا پردہ ڈھانک دیا تھا، مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک یہ کُتّے کی موت نہ مار دیا گیا" کچھ دُور آگے جا کر راستے میں ایک گدھے کی لاش سڑتی ہوئی نظر آئی۔ حضورؐ رک گئے اور ان دونوں اصحاب کو بُلا کر فرمایا "اُتریے اور اس گدھے کی لاش تناول فرمائیے" ان دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اسے کون کھائے گا؟ فرمایا فما نلتما من عرض اخیکما انفًا اشد من اکل منه "ابھی ابھی آپ لوگ اپنے بھائی کی عزت پر جو حرف زنی کر رہے تھے وہ اس گدھے کی لاش کھانے سے بہت زیادہ بُری تھی"۔

اس حرمت سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی شخص کے پیٹھ پیچھے، یا اس کے مرنے کے بعد اس کی بُرائی بیان کرنے کی کوئی ایسی ضرورت لاحق ہو جو شریعت کی نگاہ میں ایک صحیح ضرورت ہو، اور وہ ضرورت غیبت کے بغیر پوری نہ ہو سکتی ہو، اور اُس کے لیے اگر غیبت نہ کی جائے تو غیبت کی بہ نسبت زیادہ بڑی بُرائی لازم آتی ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استثناء کو اصولاً یوں بیان فرمایا ہے:

ان من اربی الربا الاستطالة فی عرض المسلم بغیر حق (ابوداؤد)	بدترین زیادتی کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کرنا ہے۔

اس ارشاد میں "ناحق" کی قید یہ بتاتی ہے کہ "حق" کی بنا پر ایسا کرنا جائز ہے۔ پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طرزِ عمل میں ہم کو چند نظیریں ایسی ملتی ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "حق" سے مُراد کیا ہے اور کس قسم کے حالات میں غیبت بقدرِ ضرورت جائز ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک بدو آکر حضورؐ کے پیچھے نماز میں شامل ہوا اور نماز ختم ہوتے ہی یہ

کہتا ہُوا چل دیا کہ "خدایا مجھ پر رحم کر اور محمدؐ پر، اور ہم دونوں کے سوا کسی کو اس رحمت میں شریک نہ کر"۔ حضورؐ نے صحابہ سے فرمایا انقولون ھو اضل ام بعیرہ؟ الم تسمعوا الیٰ ما قال؟ "تم لوگ کیا کہتے ہو، یہ شخص زیادہ نادان ہے یا اس کا اونٹ؟ تم نے سُنا نہیں کہ یہ کیا کہہ رہا تھا؟" (ابوداؤد)۔ یہ بات حضورؐ کو اُس کے پیٹھ پیچھے کہنی پڑی کیونکہ وہ سلام پھیرتے ہی جا چکا تھا۔ اس نے چونکہ حضور کی موجودگی میں ایک بہت غلط بات کہہ دی تھی، اور آپ کا اس پر خاموش رہ جانا کسی شخص کو اس غلط فہمی میں ڈال سکتا تھا کہ ایسی بات کہنا کسی درجہ میں جائز ہو سکتا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ آپ اس کی تردید فرمائیں۔

ایک خاتون فاطمہ بنت قیس کو دو صاحبوں نے نکاح کا پیغام دیا۔ ایک حضرت معاویہؓ دوسرے حضرت ابوالجہم۔ انہوں نے آکر حضورؐ سے مشورہ طلب کیا۔ آپ نے فرمایا "معاویہ مفلس ہیں اور ابوالجہم بیویوں کو بہت مارتے پیٹتے ہیں" (بخاری و مسلم)۔ یہاں ایک خاتون کے لیے مستقبل کی زندگی کا مسئلہ درپیش تھا اور حضورؐ سے انہوں نے مشورہ طلب کیا تھا اس حالت میں آپ نے ضروری سمجھا کہ دونوں صاحبوں کی جو کمزوریاں آپ کے علم میں ہیں وہ انہیں بتا دیں۔

ایک روز حضور حضرت عائشہؓ کے ہاں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے آکر ملاقات کی اجازت طلب کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اپنے قبیلے کا بہت بُرا آدمی ہے۔ پھر آپ باہر تشریف لے گئے اور اس سے بڑی نرمی کے ساتھ بات کی۔ گھر میں واپس تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا آپ نے تو اس سے بڑی اچھی طرح گفتگو فرمائی حالانکہ باہر جاتے وقت آپ نے اس کے متعلق وہ کچھ فرمایا تھا۔ جواب میں آپ نے فرمایا ان شر الناس منزلۃ عند اللہ یوم القیٰمۃ من ودعہ (او ترکہ) الناس اتقاء فحشہ "خدا کے نزدیک قیامت کے روز بدترین مقام اس شخص کا ہوگا جس کی بدزبانی سے ڈر کر لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں" (بخاری و مسلم)۔ اس واقعہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضور نے اس شخص کے متعلق بُری رائے رکھنے کے باوجود اس کے ساتھ اچھی طرح بات چیت تو اس لیے کی کہ آپ کا اخلاق اسی کا تقاضا کرتا تھا، لیکن آپ کو یہ اندیشہ ہوا کہ آپ کے گھر والے آپ کو اس سے مہربانی برتتے دیکھ کر

کہیں اسے آپ کا دوست نہ سمجھ لیں اور بعد میں کسی وقت وہ اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے، اس لیے آپ نے حضرت عائشہ کو خبردار کر دیا کہ وہ اپنے قبیلے کا بہت بُرا آدمی ہے۔

ایک موقع پر حضرت ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عُتبہ نے آکر حضور سے عرض کیا کہ "ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہیں۔ مجھے اور میرے بچوں کو اتنا نہیں دیتے جو ضروریات کے لیے کافی ہو" (بخاری و مسلم)۔ بیوی کی طرف سے شوہر کی غیر موجودگی میں یہ شکایت اگرچہ غیبت تھی، مگر حضور نے اس کو جائز رکھا، کیونکہ مظلوم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ظلم کی شکایت کسی ایسے شخص کے پاس لے جائے جو اس کو رفع کرا سکتا ہو۔

سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن نظیروں سے استفادہ کر کے فقہاء و محدثین نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ "غیبت صرف اُس صورت میں جائز ہے جبکہ ایک صحیح (یعنی شرعاً صحیح) غرض کے لیے اس کی ضرورت ہو اور وہ ضرورت اس کے بغیر پوری نہ ہو سکتی ہو"۔ پھر اسی قاعدے پر بنا رکھتے ہوئے علماء نے غیبت کی حسبِ ذیل صورتیں جائز قرار دی ہیں:

(۱) ظالم کے خلاف مظلوم کی شکایت ہر اُس شخص کے سامنے جس سے وہ یہ توقع رکھتا ہو کہ وہ ظلم کو دفع کرنے کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔

(۲) اصلاح کی نیت سے کسی شخص یا گروہ کی بُرائیوں کا ذکر ایسے لوگوں کے سامنے جن سے یہ امید ہو کہ وہ اُن برائیوں کو دُور کرنے کے لیے کچھ کر سکیں گے۔

(۳) استفتاء کی غرض سے کسی مفتی کے سامنے صورتِ واقعہ بیان کرنا جس میں کسی شخص کے کسی غلط فعل کا ذکر آجائے۔

(۴) لوگوں کو کسی شخص یا اشخاص کے شر سے خبردار کرنا تاکہ وہ اس کے نقصان سے بچ سکیں۔ مثلاً راویوں، گواہوں اور مصنفین کی کمزوریاں بیان کرنا بالاتفاق جائز ہی نہیں واجب ہے کیونکہ اس کے بغیر شریعت کو غلط روایتوں کی اشاعت سے، عدالتوں کو بے انصافی سے، اور عوام یا طالبانِ علم کو گمراہیوں سے بچانا ممکن نہیں ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص کسی سے شادی بیاہ کا رشتہ

کرنا چاہتا ہو، یا کسی کے پڑوس میں مکان لینا چاہتا ہو، یا کسی سے شرکت کا معاملہ کرنا چاہتا ہو، یا کسی کو اپنی امانت سونپنا چاہتا ہو اور آپ سے مشورہ لے تو آپ کے لیے واجب ہے کہ اس کا عیب وصواب اسے بتادیں تاکہ ناواقفیت میں وہ دھوکا نہ کھائے۔

(۵) ایسے لوگوں کے خلاف علی الاعلان آواز بلند کرنا اور ان کی برائیوں پر تنقید کرنا جو فسق و فجور پھیلا رہے ہوں، یا بدعات اور گمراہیوں کی اشاعت کر رہے ہوں، یا خلقِ خدا کو بے دینی اور ظلم وجور کے فتنوں میں مبتلا کر رہے ہوں۔

(۶) جو لوگ کسی بُرے لقب سے اس قدر مشہور ہو چکے ہوں کہ وہ اُس لقب کے سوا کسی اور لقب سے پہچانے نہ جاسکتے ہوں اُن کے لیے وہ لقب استعمال کرنا بغرضِ تعریف نہ کہ بغرضِ تنقیص۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری جلد ۱۰، ص ۳۶۲۔ شرح مسلم للنووی، باب تحریم الغیبۃ۔ ریاض الصالحین، باب ما یباح من الغیبۃ۔ احکام القرآن للجصاص و روح المعانی تفسیر آیہ ولا یغتب بعضکم بعضًا)۔

ان مستثنیٰ صورتوں کے ماسوا پیٹھ پیچھے کسی کی بدگوئی کرنا مطلقاً حرام ہے۔ یہ بدگوئی اگر سچی ہو تو غیبت ہے، جھوٹی ہو تو بہتان ہے، اور دو آدمیوں کو لڑانے کے لیے ہو تو چغلی ہے۔ شریعت ان تینوں چیزوں کو حرام کرتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ اگر اس کے سامنے کسی شخص پر جھوٹی تہمت لگائی جارہی ہو تو وہ اس کو خاموشی سے نہ سنے بلکہ اس کی تردید کرے، اور اگر کسی جائز شرعی ضرورت کے بغیر کسی کی واقعی برائیاں بیان کی جارہی ہوں تو اس فعل کے مرتکبین کو خدا سے ڈرائے اور اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

ما من امرئ یخذل امرءًا مسلماً فی موضع تنتہک فیہ حرمتہ وینتقص فیہ من عرضہ الا خذلہ اللہ تعالیٰ فی مواطن یحب فیہا نصرتہ، وما	اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جارہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جارہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا جہاں

ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟[۲۲] دیکھو، تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

من امرئ ينصر امرءاً مسلماً في موضع ينتقص فيه من عرضه وينتهك فيه من حرمته الا نصره الله عز وجل في مواطن يحب فيها نصرته (ابوداؤد)

وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو۔ اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ عزوجل اس کی مدد ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے۔

رہا غیبت کرنے والا، تو جس وقت بھی اُسے احساس ہو جائے کہ وہ اس گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے یا کر چکا ہے، اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ اللہ سے توبہ کرے اور اس حرام فعل سے رُک جائے۔ اس کے بعد دوسرا فرض اس پر یہ عائد ہوتا ہے کہ حتی الامکان اس کی تلافی کرے۔ اگر اس نے کسی مرے ہوئے آدمی کی غیبت کی ہو تو اس کے حق میں کثرت سے دعائے مغفرت کرے۔ اگر کسی زندہ آدمی کی غیبت کی ہو اور وہ خلافِ واقعہ بھی ہو تو اُن لوگوں کے سامنے اس کی تردید کرے جن کے سامنے وہ پہلے یہ بہتان تراشی کر چکا ہے۔ اور اگر سچی غیبت کی ہو تو آئندہ پھر کبھی اس کی بُرائی نہ کرے اور اُس شخص سے معافی مانگے جس کی اُس نے بُرائی کی تھی۔ علماء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ معافی صرف اس صورت میں مانگنی چاہیے جبکہ اُس شخص کو اس کا علم ہو چکا ہو، ورنہ صرف توبہ پر اکتفا کرنا چاہیے، کیونکہ اگر وہ شخص بے خبر ہو اور غیبت کرنے والا معافی مانگنے کی خاطر اسے جا کر یہ بتائے کہ میں نے تیری غیبت کی تھی تو یہ چیز اس کے لیے اذیت کی موجب ہو گی۔

۲۲ے اس فقرے میں اللہ تعالیٰ نے غیبت کو مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اس فعل کے انتہائی گھناؤنا ہونے کا تصور دلایا ہے۔ مُردار کا گوشت کھانا بجائے خود نفرت کے قابل ہے، کجا کہ وہ گوشت بھی کسی جانور کا نہیں بلکہ انسان کا ہو، اور انسان بھی

کوئی اور نہیں خود اپنا بھائی ہو۔ پھر اس تشبیہ کو سوالیہ انداز میں پیش کر کے اور زیادہ مؤثر بنا دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص اپنے ضمیر سے پوچھ کر خود فیصلہ کرے کہ آیا وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے لیے تیار ہے؟ اگر نہیں ہے اور اُس کی فطرت اِس چیز سے گھن کھاتی ہے تو آخر وہ کیسے یہ بات پسند کرتا ہے کہ اپنے ایک مومن بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر حملہ کرے جہاں وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا اور جہاں اس کو یہ خبر تک نہیں ہے کہ اس کی بے عزتی کی جا رہی ہے؟ اِس ارشاد سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ غیبت کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ اُس شخص کی دل آزاری نہیں ہے جس کی غیبت کی گئی ہو، بلکہ کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کرنا بجائے خود حرام ہے قطع نظر اِس سے کہ اُس کو اس کا علم ہو یا نہ ہو اور اس کو اِس فعل سے اذیت پہنچے یا نہ پہنچے۔ ظاہر ہے کہ مرے ہوئے آدمی کا گوشت کھانا اس لیے حرام نہیں ہے کہ مُردے کو اُس سے تکلیف ہوتی ہے۔ مُردہ بے چارہ تو اِس سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اس کی لاش بھنبوڑ رہا ہے۔ مگر یہ فعل بجائے خود ایک نہایت گھناؤنا فعل ہے۔ اسی طرح جس شخص کی غیبت کی گئی ہو اس کو بھی اگر کسی ذریعہ سے اس کی اطلاع نہ پہنچے تو وہ عمر بھر اس بات سے بے خبر رہے گا کہ کہاں کس شخص نے کب اس کی عزت پر کن لوگوں کے سامنے حملہ کیا تھا اور اس کی وجہ سے کس کس کی نظر میں وہ ذلیل و حقیر ہو کر رہ گیا۔ اِس بے خبری کی وجہ سے اُسے اِس غیبت کی سرے سے کوئی اذیت نہ پہنچے گی، مگر اس کی عزت پر بہر حال اس سے حرف آئے گا، اس لیے یہ فعل اپنی نوعیت میں مُردہ بھائی کا گوشت کھانے سے مختلف نہیں ہے۔

یورپ کی تحریکِ اصلاحِ مذہب

عبدالحمید صدّیقی

بہت سے تاریخی حادثات کی طرح یورپ کی تحریکِ اصلاحِ مذہب بھی ایک بہت بڑا تاریخی المیہ ہے۔ مادیت کے علمبرداروں نے اپنے بیشمار وسائل صرف کر کے اس تحریک کے بارے میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ مسیحیت کے لیے سراپا راحت تھی۔ اس نے اس کے متزلزل قصر کو سہارا دیا اور مذہب جو دنیا سے قریب قریب ناپید ہونے والا تھا اس میں زندگی کی تازہ روح پھونک دی۔

خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے جو چاہیں کہتے رہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس تحریک سے مسیحیت اور خود مذہب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ یہ تحریک تجدید و اصلاحِ مذہب کا کوئی قابلِ رشک کارنامہ نہ تھا بلکہ مادیت کے سامنے مذہب کی شکست کا کھلا اعتراف تھا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ مسیحیت "امورِ دنیا" میں انسان کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہے اور اس کے ماننے والے اپنے اجتماعی مسائل کو حل کرنے میں یکسر آزاد ہیں۔ مذہب اُن پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کا مجاز نہیں۔ سرمایہ کی فراہمی، کسبِ معاش، پیدائشِ دولت، تقسیمِ دولت، قوموں کے باہمی تعلقات، نظامِ معیشت کی ہیئت اور نظامِ سیاست اور معاشرت کی ترتیب، الغرض زندگی کے کسی معاملے میں بھی اب مذہب کوئی فیصلہ کُن اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ محض انسان کی روحانی تسکین کا ایک ذریعہ ہے اور اُسی شخص کے لیے کچھ مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے جو روحانیت کے خبط میں مبتلا ہو۔ عام انسانوں کے لیے یہ کسی اہمیت کا حامل نہیں اور وہ اس سے جس قدر دامن بچا کر چلیں اُن کے لیے بہتر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تحریک کا آغاز اصلاحِ مذہب کے مقدس جذبے سے ہوا لیکن اس جذبے نے جو عملی صورت اختیار کی وہ سرتاپا مذہب سے انحراف اور بغاوت تھی اور اس کا تجدیدِ مذہب

سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آیئے سب سے پہلے ذرا اُس اندوہناک صورتِ حال کا جائزہ لے لیں جس کی اصلاح کے لیے مارٹن لوتھر اور اس کے متبعین اُٹھے تھے۔

اس دَور کی مذہبی حالت کا جو نقشہ ہمیں مختلف کتب میں ملتا ہے اُس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی حلقوں میں سب سے زیادہ اضطراب سائنس کے انکشافات سے پیدا ہُوا۔ خداوندانِ کلیسا خالقِ کائنات اور کائنات کے بارے میں جن تصورات کو ایمانیات کی حیثیت سے خود مانتے چلے آرہے تھے اور مسیحیت کے پیروؤں سے تسلیم کروانے پر مُصر تھے انہیں سائنس کی نئی معلومات سے سخت دھچکا لگا۔ معرکۂ مذہب و سائنس کے فاضل مصنف ڈاکٹر ولیم ڈریپر نے ان اعتقادات کی بڑی تفصیل درج کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ پادریوں کے نزدیک زمین کو چپٹا سمجھنا ایمان کا ضروری جزو خیال کیا جاتا تھا لیکن سائنس کی تحقیقات نے اُسے گیند کی مانند گول ثابت کردیا۔ پھر ان مذہبی طبقوں کے خیال کے مطابق یہ زمین ساکن سمجھی جاتی تھی اور باقی اجرام فلکی اس کے گرد گھومتے ہوئے تصوّر کیے جاتے تھے۔ لیکن سائنس دانوں نے اس خیال کو جھٹلا دیا اور زمین کی گردش کا نظریہ پیش کیا۔

اگر اُس دَور کا مذہبی طبقہ ذرا عقل و دانش سے کام لیتا تو سائنس اور مذہب کے درمیان کسی قسم کی کشمکش نہ پیدا ہوتی لیکن اس طبقے نے قدیم عیسائیوں کی سائنسی تحقیقات کو بھی ایمانیات میں شامل کرلیا اور ہر اُس فرد کو ملحد، بے دین اور دہریہ قرار دیا جو قدیم جغرافیہ دانوں اور سائنس دانوں کے نظریات کی صحت کو پوری طرح تسلیم نہ کرتا تھا۔ پھر اس طبقے نے مزید حماقت یہ کی کہ ان فرسودہ تصورات کو جن کا مذہب سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہ تھا لوگوں سے بالجبر منوانے کی کوشش کی اور جن من چلوں نے انہیں ماننے سے انکار کیا انہیں بڑی عبرتناک سزائیں دیں۔

اگر ان لوگوں میں سے کوئی طبقہ فہم و فراست سے کام لیتا تو سائنس اور مذہب کے درمیان یہ کشمکش کوئی تشویشناک صورت اختیار نہ کرتی۔ اصلاح مذہب کے علمبرداروں کا اس

معاملے میں سب سے پہلا اور بنیادی فرض تھا کہ وہ سائنس اور مذہب کے دائرۂ کار متعین کرتے اور عوام کو بتلاتے کہ انجیل کوئی جغرافیہ یا ہیئتِ ارضی کی کتاب نہیں ہے بلکہ کتابِ ہدایت ہے۔ اس کا کام آفاق کے مستور گوشوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ انسان کے اخلاق کو سنوارنا اور کائنات، اُس کے خالق اور انسان کے درمیان جو مختلف رشتے قائم ہیں انہیں صحیح بنیادوں پر استوار کرنا ہے۔

یہ تحریکِ اصلاحِ مذہب کی سب سے پہلی ناکامی تھی جس نے تبدیلی کے دھارے کو خالص الحاد کی بنیاد پر ڈال دیا۔ ہیئتِ ارضی کے بارے میں جب مذہبی نظریات کی صحت مخدوش ہوئی تو لوگوں کے دلوں میں پورے مذہب کے بارے میں مختلف شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے اور انہوں نے جب یہ دیکھا کہ مذہبی طبقہ شکوک کے ان کانٹوں کو حکمت و دانائی کے ساتھ چُننے کے بجائے اندھی بہری طاقت کے بل پر بعض غیر عقلی باتوں کو منوانے پر بے جا اصرار کر رہا ہے تو انہوں نے سارے مذہبی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔

تجدید و اصلاحِ مذہب کا دوسرا میدان کلیسا کا نظام تھا۔ یہ نظام اپنی اساس کے اعتبار سے بڑا مفید اور کارآمد ہے اور اس نے دینِ مسیحی کو پھیلانے میں بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ پھر اس کی آغوش میں بعض افراد نے مذہبی نقطۂ نظر سے بڑی اچھی تربیت پائی اور وہ سیرت و کردار کے اعتبار سے مسیحیت کے نہایت اعلیٰ نمونے ثابت ہوئے۔ اس نظام نے آغاز میں بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کو پناہ دی اور یتیموں اور بیواؤں کی معاونت اور دستگیری کی، طلبا کو اس کے مالیات سے معقول وظائف دیئے گئے اور انہوں نے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

ان خدمات کے علاوہ کلیسا نے ظالم بادشاہوں اور سفّاک اُمراء کے ظلم و ستم کے خلاف آغاز میں ایک مضبوط حصار کا کام دیا۔ ان بگڑے ہوئے اصحابِ اقتدار سے بچنے کے لیے ستم رسیدہ لوگ کلیساؤں کا رُخ کرتے اور ان کے جرأت مند محافظ اور نگران بڑی جرأت

اور بے باکی سے ظلم کا مقابلہ کرتے بلکہ بسا اوقات وہ مظلوموں کی حمایت میں جان تک قربان کر دیتے۔ یہ ان پاکباز لوگوں کے جذبۂ ایثار اور جرأت کا نتیجہ تھا کہ مطلق العنان بادشاہ اپنی روش کو ایک ضابطے اور قاعدے کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہو گئے اور جب کبھی انہوں نے طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر غریب عوام کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی تو کلیسا کے خادموں نے بڑی جوانمردی اور ہمت و استقلال کے ساتھ ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ کلیسا صحیح معنوں میں آفت رسیدہ لوگوں کے لیے حصار کی حیثیت رکھتے تھے جہاں زخموں سے چُور انسانیت پناہ لے کر اپنی زندگی کو مامون و محفوظ پاتی۔

مگر افسوس یہ صورتِ حال دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ کلیساؤں کو نقدی، اراضی اور غلّے کی شکل میں جو عطیات ملتے رہے انہوں نے پادریوں اور راہبوں کو دنیا پرست بنا دیا اور وہ مال و دولت کی محبت میں کھو کر اپنے اصل فرائض سے یکسر غافل ہو گئے۔ پھر ان کلیساؤں کی طرف جن نوجوانوں نے تعلق باللہ قائم کرنے کے لیے رجوع کیا، اُن میں سے ایک بڑی قلیل تعداد ہی کامیاب ہوئی۔ ان کی عظیم اکثریت نے ضبطِ نفس، اخلاقِ حسنہ، خدا خوفی اور پرہیزگاری کا سبق سیکھنے کی بجائے عیش پرستی کے گُر سیکھے۔ پادریوں کی اخلاق سوز حرکات نے ان نوجوانوں کو ذہنی آوارگی میں مبتلا کر دیا۔ خانقاہوں میں نوجوان راہبوں اور راہبات کی یکجائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور دیکھتے دیکھتے مسیحیت کے ان مذہبی مراکز کی ساری فضا مکدّر ہو کر رہ گئی۔ اس سلسلے میں ایک نامور مورخ کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔

> وہ کلیساؤں کے خادم روپے پیسے کے معاملے میں اتنے ہی حریص اور بددیانت تھے جتنے کہ اُس دور کے سرکاری ملازم، بددیانتی اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی جس طرح عام عدالتوں میں انصاف کو خریدا جا سکتا تھا بالکل اسی طرح مذہبی عدالتوں کے فیصلوں پر بھی لوگ روپے کی مدد سے اثر انداز ہو جاتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر بڑے سے بڑے گناہ کی رعایت مل سکتی

تھی۔"[1]

ایک دوسرا راہب اپنے ساتھیوں کے اعمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ان لوگوں کا سارا دن فحش کلامی اور عیش و عشرت میں گزرتا ہے ...... ان کے دل خوفِ خدا سے یکسر خالی ہیں اور باری تعالیٰ کی محبت کے بجائے ان کے قلب و دماغ پر دنیا کی محبت چھائی ہوئی ہے۔ آخرت کا تصور اور احساس جوابدہی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جنسی لذات کی تسکین اب زندگی کا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ بن کر رہ گیا تھا"[2]

مغفرت ناموں اور جنت کے قبالوں کی فروخت نے لوگوں کو گناہ کے ارتکاب میں کافی حد تک جری بنا دیا تھا۔ اُن کے دلوں میں یہ خیال پوری طرح راسخ ہو چکا تھا کہ وہ روپے کے صرف سے نہایت گھناؤنے سے گھناؤنے جرم کو بآسانی معاف کروا سکتے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے چانسلر نے ۱۴۵۰ء میں عوام کی اس دیدہ دلیری کا مندرجۂ ذیل الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

"آج کل مجرم اور گناہ گار بڑی بے تکلفی سے یہ کہتے ہیں مجھے اس بات کی ذرہ برابر پروا نہیں کہ میں کتنی برائیوں کا ارتکاب کر رہا ہوں کیونکہ میں نے پوپ سے چار پانچ پنس میں مغفرت نامہ خرید لیا ہے"[3]

کلیسا کی یہ اندوہناک اخلاقی حالت اس بات کی متقاضی تھی کہ مسیحیت کے سچے پیروؤں میں کوئی فرد یا گروہ اٹھتا اور اس نظام کے اچھے اور روشن پہلوؤں کو جوں کا توں برقرار رکھ کر اس کے اندر جو برائیاں راہ پا چکی تھیں انہیں دور کرتا لیکن تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علمبرداروں نے اس پورے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

کلیسا کی سب سے بڑی افادیت یہ تھی کہ اس نے مختلف قوموں اور ملکوں سے تعلق رکھنے والے

---

[1] WILL DURANT : THE STORY OF CIVILIZATION PART VI. P. 18.

[2] CAULTON : LIFE IN THE MIDDLE AGE VOL. I. P. 410

[3] THE STORY OF CIVILIZATION P. 23.

افراد کو اخوت کے روحانی رشتے میں منسلک کر رکھا تھا پھر اس کلیسا کی بدولت اہلِ یورپ مذہبی ضابطوں کے پابند تھے۔ اس کے تحت افراد کی تربیت کی جاتی تھی۔ پوپ کی ذات عوام کی عقیدت کا محور و مرکز تھی اور اس طرح عوام کے اندر ایک مذہبی احساس بیدار رہتا تھا۔ تحریکِ تجدید مذہب کے علمبرداروں نے بڑی نادانی سے کلیسا کے ان روشن پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا اور کلیسا کی بین الاقوامی حیثیت ختم کر کے ان مذہبی اداروں کی باگ ڈور ہر ملک کے فرمانروا کے سپرد کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب انسانی رشد و ہدایت کا ذریعہ بننے کے بجائے دنیا پرست اصحابِ اقتدار کے ہاتھ میں آلہ کار بن کر رہ گیا۔ کلیسا اب غریبوں کا سہارا اور پناہ گاہ نہ تھا بلکہ فرمانرواؤں کے اقتدار کا مرکز تھا۔ کلیسا کے ہاتھ میں آجانے کے بعد برسرِ اقتدار طبقہ جس طرح چاہتا سادہ لوح عوام کو مذہب کے نام پر لوٹتا۔ پہلے جو ریشہ دوانیاں بگڑے ہوئے راہب اور پادری بڑے محدود پیمانے پر کر رہے تھے وہ اب فرمانرواؤں نے بڑے وسیع پیمانے پر کرنی شروع کر دیں۔ اوقاف کے بڑے وسیع ذرائع اور ان کی غیر محدود دولت نیک اور مقدس کاموں پر صرف ہونے کے بجائے برسرِ اقتدار طبقوں کی عیاشیوں پر صرف ہونے لگی اور اس دولت پر ایک ایسا گروہ پلنے لگا جسے مذہب سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا بلکہ جس کی زندگی کا مقصد باری تعالیٰ کی پرستش کے بجائے تخت و تاج کے وارثوں کی پرستش تھا۔

ممکن ہے سطح بیں آنکھیں اس تبدیلی کو کوئی معمولی تبدیلی سمجھیں، لیکن جو حضرات مذہب کی تاریخ سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح شناسا ہیں کہ کلیسا کو حکومت کا تابع مہمل بنانے سے مسیحیت کا سارا زور ٹوٹ کر رہ گیا اور اس کے بعد مسیحیت اپنے حفظ و بقا تک کے لیے حکمرانوں کی چشمِ التفات کی محتاج ہو گئی۔ وہ اب مذہب سے جس طرح چاہتے کام لیتے۔ انہیں کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔ اس مرکز کے ایک مرتبہ ٹوٹ جانے کے بعد یورپ میں پھر مذہب برابر پسپا ہوتا چلا گیا اور پسپائی کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے بلکہ اب صورت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ مذہب کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

پھر کلیسا کے مرکزی نظام کے درہم برہم ہونے کے بعد ہر ملک نے سیاسی تقاضوں کے پیشِ نظر

مسیحیت کا اپنا ایک الگ ایڈیشن تیار کیا۔ چنانچہ اگر ایک ملک میں مسیحیت جمہوریت کی ہمنوا تھی تو دوسرے ملک میں آمریت کی علمبردار۔ ایک ملک میں اگر یہ فرد کی آزادی کے حق میں تھی تو دوسرے ملک میں وہ اس آزادی کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ مذہبی دائرے میں فکر و عمل کے اس انقلاب نے مذہب کی رہنما حیثیت ختم کر کے اُسے برسر اقتدار طبقوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بنا دیا تھا جس سے وہ جس طرح چاہتے بے تکلف کھیلتے۔

بگڑے ہوتے راہبوں اور پادریوں نے بلاشبہ مذہب کو نقصان پہنچایا لیکن جس قسم کا نقصان اُن سے پہنچ رہا تھا وہ قابل تلافی تھا۔ انسانی ضمیر نے ہمیشہ بُرائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے اِس بنا پر اس بات کی پوری توقع تھی کہ تجدید و اصلاح مذہب کی کوئی اچھی تحریک اٹھ کر مذہبی طبقوں کے ضمیر کو جھنجوڑتی اور انہیں صورتِ حال کی اصلاح پر آمادہ کرتی۔ لیکن مذہب کو اقتدار کا تابع بنانے سے مذہب کی افادیت یکسر ختم ہوگئی اور یہ واقعی انسانیت کے لیے افیون بن کر رہ گیا جس سے حکمرانوں نے عوام کے شعور اور احساس کو مُردہ کرنے میں پُورا پورا کام لیا۔

یورپ کی تحریکِ اصلاحِ مذہب کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ جو لوگ کلیساؤں میں اخلاقی بگاڑ کو دُور کرنے کے لیے اٹھے تھے وہ خود مختلف نوعیتوں کی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا تھے اور انھوں نے ان مذہبی اداروں میں بُرائی کو مٹانے کے بجائے اسے اپنے غلط نظریات کی وجہ سے قوت فراہم کی۔

ورہیر اور ڈینی فائل نے لوتھر کے مکتوبات میں سے بعض ایسے اقتباسات نقل کیے ہیں جن سے اُس کی اخلاقی بے راہ روی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے متبعین کو راہبات کی عصمت دری پر اُبھارا اور اس مذموم فعل کو ایک بہت بڑی دینی خدمت سمجھ کر اس کی تعریف کی۔ آرنلڈلون نے لوتھر کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں وہ کوپ جیسے شخص کو جو عفت کا لٹیرا تھا ایک "مقدس ڈاکو" کا خطاب دیتا ہے اور اس کے اس قبیح فعل کو بڑے زوردار الفاظ میں سراہتا ہے۔ ایک دوسرا مصنف ڈینی فائل لوتھر کے ایک عاشقِ زار کی "فتح مندیوں" کے تاثرات یوں قلمبند کرتا ہے۔ وہ لوتھر کو مخاطب کرتے

ہوئے لکھتا ہے:

"نو راہبات ہمارے حصے میں آئی ہیں، وہ حسین اور خوبصورت ہیں اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن میں سے ایک جس کی عمر پچاس برس کی ہے وہ آپ کے لیے مختص ہے۔ اگر آپ نوعمر کے خواہشمند ہوں تو اُس کے دینے میں بھی ہمیں کوئی تامل نہیں[1]"

تاریخ کا یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ جو شخص پادریوں اور راہبوں کے اخلاقی انحطاط پر زبردست احتجاج کرتا ہے اور اس اندوہناک صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے اصلاحِ مذہب کی ایک تحریک اٹھاتا ہے وہ خود نیکی اور بدی کے بارے میں نہایت گمراہ کُن نظریات کا پرچار کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو بڑے واشگاف الفاظ میں یہ کہتا کہ اگر تمہیں گناہ کرنا ہے تو جرأت کے ساتھ کرو۔ جب شیطان تمہیں اس کی ترغیب دے تو تمہارا فرض ہے کہ تم خلوت سے نکل کر جلوت میں آجاؤ اور جی بھر کر شراب پیو۔ کبھی کبھار انسان کو نشے میں بدمست ہو جانا چاہیے، اور مختلف قسم کی بیہودگیوں کا بڑی خوشدلی سے ارتکاب کرنا چاہیے تاکہ اس کا ضمیر غیر معمولی حد تک حساس نہ رہے اور معمولی معمولی گناہوں سے اس میں اضطراب نہ پیدا ہونے پائے۔ اسی وجہ سے میں نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ جب شیطان مجھے بُرائی سے روکتا ہے تو میں بڑے شوق کے ساتھ بُرائی کا ارتکاب کرتا ہوں اور فحش کلامی سے اپنا دل بہلاتا ہوں اور اس طرح شیطان کے تسلط سے اپنے آپ کو نجات دلانے میں کامیابی حاصل کرتا ہوں[2]"

لوتھر انسان کی مذہبی ذمہ داری کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"خدا کا انسان پر اس کے علاوہ اور کوئی حق نہیں کہ صرف اُس کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ باقی تمام معاملات میں انسان آزاد ہے اور وہ ضمیر کی معمولی خلش کے بغیر اپنے منشا اور مرضی کے مطابق ہر فعل کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ وہ شخص جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ یسوع مسیح نے اُس کے گناہوں کا کفارہ دے دیا ہے وہ اُس مقدس ذات کی طرح ہی پاکیزہ اور بے گناہ ہے[3]"

---

1 REVOLT AGAINST REASON. P. 40
2 do P. 41

یہ غالباً لوتھر کی اسی آزاد مشربی کا نتیجہ تھا کہ اس کے متبعین میں ایسے لوگ شامل ہو گئے جن کی عظیم اکثریت مذہب سے کوئی گہرا تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ یہ گروہ اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو مذہبی بندھن توڑ کر حسی لذات کی تسکین کے آرزومند تھے اور اس معاملے میں دل کے سارے ارمان نکالنے کے لیے بیتاب تھے۔ اس حقیقت کا خود لوتھر نے اعتراف کیا ہے:

"میں اپنے اردگرد ایسے لوگوں کو جمع پاتا ہوں جنہوں نے لذت کے حصول کے لیے خانقاہوں کا رُخ کیا اور اب اسی مقصد کی خاطر انہیں خیرباد کہہ دیا ہے . . . .
اب جبکہ ایک بُرائی کا خاتمہ ہُوا ہے تو متعدد نئی برائیاں اُبھر کر سامنے آگئی ہیں۔ آج لوگ پوپ کے عہدِ اقتدار کی بہ نسبت کہیں زیادہ حریص، سفاک اور ناعاقبت اندیش ہیں۔ حسد، کینہ، روپے پیسے کی نہ مٹنے والی ہوس، اخلاقی بے راہ روی، جھوٹ، مکر اور فریب کا دَور دورہ ہے۔ اس قسم کی غیر منضبط زندگی کو دیکھ کر کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ کہیں ہماری انجیل ہی میں کوئی سقم تو نہیں کیونکہ اگر اس کی تعلیمات بالکل صحیح اور برحق ہیں تو پھر اس کے پیرؤوں کو زیادہ نیک اور خدا ترس ہونا چاہیے تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم دینِ مسیحی کی تبلیغ و اشاعت میں جس قدر جذب و شوق اور انہماک کا ثبوت دیتے ہیں اُسی نسبت سے لوگوں کی دینی حالت بگڑتی چلی جاتی ہے۔ کاش مجھے اس تحریک اور اس کے ان روح فرسا نتائج کا دس بارہ برس پیشتر کچھ بھی اندازہ ہوتا تو میں اس کا کبھی آغاز نہ کرتا۔"[1]

اس تحریک کی وجہ سے اخلاقی انارکی کا جو طوفان اٹھا وہ یورپ کی معاشرتی زندگی کے لیے بڑا تباہ کُن تھا اور اس کی وجہ سے خیر و شر کے سارے تصورات بالکل برباد ہو کر رہ گئے۔ لوتھر کے ایک بہت بڑے معتقد نے عوام کی اخلاقی حالت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

"بہت سے لوگ اب اس انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں جیسے کہ انہیں ہر قسم کی

---

[1] REVOLT AGAINST REASON P. 62

بُرائیوں کے ارتکاب کی کھلی چھٹی مل چکی ہے اور شیطان کا وجود قطعاً باقی نہیں رہا۔ انہیں
اب نہ تو دوزخ کا ڈر ہے اور نہ باری تعالیٰ کے احتساب کا کوئی خطرہ"

مارٹن لوتھر اور اُس کے رفقائے کار کے یہ تاثرات کوئی سربستہ راز نہیں جن کا کھوج لگانے میں انسان کو کوئی دقت محسوس ہو رہی ہو۔ جو شخص بھی تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علمبرداروں کی تحریروں کا مطالعہ کرے گا اُسے اس تحریک کے خطرناک اخلاقی نتائج کی بیسیوں شہادتیں ملیں گی۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مذہبی طبقوں کی دنیا پرستی نے کلیسا اور خانقاہوں کی حالت کو اخلاقی اور دینی اعتبار سے کافی حد تک تباہ کر دیا تھا اور صورتِ حال کی اصلاح ناگزیر تھی لیکن مارٹن لوتھر کے ہاتھوں اصلاحِ مذہب کی جو تحریک اٹھی اُس نے حالات کو سنوارنے اور بہتر بنانے کے بجائے انہیں مزید خراب کیا۔ اوباش اور اخلاق باختہ لوگ جو مذہب کے نظامِ اخلاق کے پابند نہ تھے اور ان پابندیوں کو حسی لذات کی تسکین میں مانع سمجھتے تھے وہ فوراً اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں اخلاقی ضابطے بالکل تار تار ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ خود لوتھر نے متعدد جگہ اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ جن بُرائیوں کے سدباب کے لیے اُس نے اس تحریک کو اٹھایا تھا۔ اُس میں وہ سخت ناکام ثابت ہوا اور ان برائیوں سے کہیں زیادہ شدید مفاسد نے پوری قوت کے ساتھ سر اٹھایا[1]۔

اس تحریک کے علمبرداروں نے مذہب کو ایک اور نقصان یہ پہنچایا کہ لوگوں کے لیے کتاب مقدس کی من مانی تاویلات کا دروازہ کھول دیا۔ اس کام کے لیے زمین بڑی چابکدستی سے ہموار کی گئی۔ سب سے پہلے لوگوں کی توجہ اس بدیہی حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی کہ یہ ایک کتابِ ہدایت ہے اور ہدایت کا ہر فرد محتاج ہے اس لیے اس کے سمجھنے کا ہر شخص کو پورا پورا حق حاصل ہونا چاہیے۔ یہ بات ہر لحاظ سے صحیح اور درست تھی۔ چنانچہ عوام نے اسے اپنے دل کی آواز سمجھ کر بڑی خوشدلی کے ساتھ قبول کیا۔ اور اُن کے اندر بائیبل کے معانی اور مطالب سمجھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس ذوق کی تسکین کے

[1] REVOLT AGAINST REASON P. 63.

لیے کتابِ مقدس کے متعدد تراجم شائع ہوئے ، اور لوگ ان تراجم کے پڑھنے میں منہمک ہو گئے ۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تراجم اصل کتاب کی بلاغت ، اُس کی فکر انگیزی ، اس کے سوز و گداز اس کی گہری معنویت کو اپنے دامن میں پوری طرح سمیٹنے سے قاصر تھے ۔ چنانچہ اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ عوام کے شعور و وجدان کا رشتہ الہامی زبان سے کٹ گیا اور کتابِ الٰہی اور اس کے الفاظ کی تقدیس غیر شعوری طور پر دلوں سے مٹنے لگی ۔

پھر لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ خالق و مخلوق کے درمیان ان " پیرانِ کلیسا " نے جو پردے حائل کر رکھے ہیں یہ سراسر ظلم و زیادتی ہے اس لیے سب سے پہلے اس طبقے کو ختم کرنا چاہیے ۔ کتابِ مقدس کی تعبیر و تشریح اُن کا کوئی خصوصی اور موروثی حق نہیں کہ اُن کی تعبیرات کو ہی صحیح اور برحق سمجھا جائے ۔ یہ حق ہر شخص کو حاصل ہے ۔ یہ بات بھی بظاہر بالکل صحیح معلوم ہوتی تھی ۔ چنانچہ اس کی صحت کو ہر ہوشمند شخص نے تسلیم کیا مگر جب اس کے عملی مضمرات سامنے آئے تو اس سے پورے مذہب کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابِ مقدس کو سمجھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے لیکن اس کام کے لیے ایک خاص معیار کی قابلیت بھی تو ضروری ہے ۔ کلیسا کا نظام اس مقصد کے لیے برسوں افراد کی تربیت کرتا تھا اور پھر کہیں جا کر وہ انہیں اس کا اہل قرار دیتا تھا لیکن اس تحریک نے یہ صورتِ حال پیدا کر دی کہ ہر کس و ناکس نے بائیبل کے مطالب کی از خود تحقیقات شروع کر دی ۔ جو شخص بھی معمولی لکھ پڑھ سکتا تھا اُس نے اس کے مفہوم اور مدعا کو متعین کرنے کی کوشش کی ۔ اگر معاملہ محض سمجھنے کی حد تک محدود رہتا تو پھر بھی اس بائیبل فہمی کے نتائج زیادہ خطرناک نہ ہوتے لیکن ان من چلوں نے اپنے آپ کو کتابِ مقدس کی تعبیر اور اس سے فقہی استدلال اور استنباط کے لیے موزوں اور اہل خیال کیا اور انہوں نے اس کے احکام کی اپنے حسبِ منشا اور مرضی تشریح و توجیہ کی اور اس طرح یہ مقدس کتاب بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئی ۔

مذہب میں ایک ضروری عنصر روایت کا بھی ہے ۔ روایات کے مقدس اور لطیف تار

ماضی کو حال اور مستقبل سے مربوط کرتے ہیں۔ مذہب کو ایک انقلاب انگیز تحریک، ایک زندہ قوتِ فکر و عمل بنانے میں روایات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ ان کے اثر کے تحت انسان خارجی پابندیوں کے بغیر خود اپنے آپ کو ایک اخلاقی نظام کا پابند بناتا ہے۔ اپنے سامنے سیرت و کردار کے اعلیٰ نمونے پاکر بغیر کسی دباؤ کے، اپنی زندگی کو اُن کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ روایات مثبت طور پر انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر نبی نے اپنے پیچھے جہاں لوگوں کی رشد و ہدایت کے لیے الہامی کتاب چھوڑی وہاں اس نے اچھی اور مقدس روایات کا ایک بیش قیمت سرمایہ بھی چھوڑا جس کے پس منظر میں لوگوں نے کتابِ الٰہی کے معانی و مطالب متعین کیے۔ اس پس منظر کو نظر انداز کرنے سے بعض اوقات سارے دین کا تصور بدل جاتا ہے۔

تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علم برداروں نے روایات کی اس غیر معمولی افادیت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، انھیں برباد کرنے کی کوشش کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ یہ روایات بیکار کی زنجیریں ہیں۔ یہ کتاب الٰہی کے مطالب کو محدود اور انسانی عقل کو مفلوج کرتی ہیں۔ اس دعویٰ میں بلاشبہ ایک جزو صداقت کا بھی ہے بعض غلط قسم کی روایات مذہبی نظام میں راہ پاکر اس کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں کا کام دیتی ہیں اور انسانی عقل و شعور کو پُوری طرح برومند ہونے کا موقع نہیں دیتیں لیکن اس سے بڑی نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ محض چند ایسی روایات کی آڑ لیکر اس پورے نظام کو درہم برہم کر دیا جائے اور اس کے ایک ایک نقش کو مٹانے کی ناپاک کوشش کی جائے۔ اس غلط طرزِ فکر کے جو نتائج یورپ میں رُونما ہوئے وہ بہت حوصلہ شکن ہیں اور انھیں دیکھ کر اس طرزِ استدلال کی غلطی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ روایات کے بندھنوں نے اہلِ یورپ کو فکری اور جذباتی اعتبار سے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا۔ پھر ان کی تقدیس کی وجہ سے عوام کے دلوں میں ضبطِ نفس کا احساس بیدار تھا اور اس طرح معاشرتی زندگی کی تشکیل میں ناروا جکڑ بندیوں کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی لیکن جب روایات کے یہ بندھن ٹوٹے تو لوگوں کے سفلی جذبات میں زبردست تلاطم پیدا ہوا۔ اخلاقی قدریں جن کی وجہ سے ایک اجتماعی

نظامِ قائم تھا وہ یکسر پامال ہو گئیں اور انسانوں کو اپنے جائز حدود میں مقید رکھنے اور انہیں اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں کا پابند بنانے کے لیے آمریت کا ایک نہایت جابرانہ نظام وضع کرنا پڑا۔ چنانچہ خود لوتھر اس نوعیت کے نظام کی بڑے زوردار الفاظ میں حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست کے جابرانہ نظام کے بغیر کسی اچھے معاشرے کی تعمیر نہیں کی جا سکتی[۱]۔ وہ انسانی آزادی اور مساوات کے مذہبی تصورات کو یکسر باطل سمجھتا ہے اور حکومت کو اس بات کا پورا پورا اختیار دیتا ہے کہ وہ افراد اور دیگر انسانی اور مذہبی اداروں کی آزادی کو اپنے مفادات کے پیشِ نظر کچل کر رکھ دے۔

روایت سے بغاوت اور آمریت دونوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تاریخِ انسانی اس بدیہی حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ جن تحریکات نے بھی عوام کو روایات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی دعوت دی انہوں نے ایک سخت گیر آمرانہ نظام کی بھی حمایت کی کیونکہ اگر انسان از خود اپنے آپ کو کسی آئین و ضابطے کا پابند بنانے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تو اسے خارجی جکڑ بندیوں کے ذریعہ ہی کسی مخصوص روش پر چلنے کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علمبردار اس کے فوائد بیان کرتے ہوئے بڑے فخر سے یہ بات کہتے ہیں کہ یہ تحریک درحقیقت عقل کی جذبات پر فتح تھی۔ اس کے بعد انسان نے مذہبی معاملات پر عقل کی روشنی میں غور کرنا شروع کیا اور خلافِ عقل باتوں کو دین سے خارج کر کے رکھ دیا۔ مارٹن لوتھر نے اپنی بعض تحریروں میں عقل کے نور کی بڑے والہانہ انداز میں تعریف کی ہے۔

> "انسان کو قدرت نے جس قدر عطیات دیئے ہیں اُن میں عقل سب سے بہتر عطیہ ہے، یہ تمام علوم و فنون کی جان، قوت کا سرچشمہ، نیکی، پرہیزگاری، عزت و وقار کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ انسان کو دوسری مخلوقات سے صرف عقل ہی ممیز اور ممتاز کرتی ہے[۲]۔"

لیکن دوسرے مقامات پر وہ اسی عقل کے خلاف دل کھول کر زہر اگلتا ہے اور اسے سب سے

---

[۱] REVOLT AGAINST REASON P. 64.

[۲] CHRLES BEARD: THE REFORMATION P. 154.

زیادہ خطرناک درندے اور اژدہے سے تعبیر کرتا ہے۔ کبھی وہ اسے شیطان کی بدصورت دلہن اور باری تعالیٰ کا سب سے بڑا دشمن کہتا ہے۔ ایک مقام پر وہ عقل کی حدود و قیود کی تصریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے زندگی کے عام معاملات میں تو رہنمائی لی جا سکتی ہے لیکن مذہبی اور روحانی امور میں یہ بالکل بیکار ہے کیونکہ ایمان اور عقل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔[1]

یُوں تو لوتھر کے سارے کلام میں ہمیں عجیب و غریب تضاد نظر آتا ہے لیکن عقل کے بارے میں اُس نے جو مخالف موقف اختیار کیے ہیں وہ اس کی فکری کجی کے ہر لحاظ سے آئینہ دار ہیں۔ اُس کے حامیوں نے اس تضاد کو دُور کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں قطعاً کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس تضاد کی وجہ لوتھر کی کوتاہ اندیشی، فکری بے راہ روی اور پست ہمتی ہے۔ اس نے عقل کی آڑ میں مذہبی روایات اور اس کے ضابطۂ اخلاق کے خلاف بغاوت کی۔ پھر اس عقل کی بنیاد پر ہی کلیسا سے جنگ لڑی اور کتابِ مقدس کی من مانی تاویلات کیں۔ ان کاموں میں چونکہ عقل کی بالادستی تسلیم کرنے سے کامیابی کا حصول ممکن تھا اس لیے اس نے ان معاملات میں عقل کی فضیلت بیان کی لیکن مسیحیت اور اس کے نظام میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جنہیں لوتھر اور اُس کے ساتھی خاص عقلی اساس پر صحیح اور برحق ثابت کرنے سے قاصر تھے اس لیے انہوں نے عقل کو کوسنا شروع کیا۔ پھر خود لوتھر نے جو نظریات پیش کیے اُن میں سے بیشتر ایسے تھے جن کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہ تھی اس لیے وہاں عقل کی بے بسی اور عاجزی کو اُبھارا گیا اور جذبات کی افادیت پر زور دیا گیا۔ اُس نے ان خیالات کا کئی مقامات پر اظہار خیال کیا ہے:

> "سارے ارکانِ مسیحیت جن کی خداوند تعالیٰ نے کتابِ مقدس میں نشاندہی کی ہے، انسانی عقل سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتے۔ ہمارے لیے عقلی طور پر یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ہم مرکر حشر کے دن پھر زندہ کیے جائیں گے، پھر ہم عقل کی رُو سے مسئلۂ تثلیث کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ تین میں ایک اور ایک میں تین کا چکر

---

[1] REVOLT AGAINST REASON

انسانی سمجھ سے بالاتر ہے۔ خدا انسان کیونکر بن سکتا ہے . . . یہ سب باتیں عقل سے ماورا ہیں اور اس لیے بڑی عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں مگر انہیں دل و جان سے تسلیم کرنے ہی میں ایمان کا راز مضمر ہے۔[۱]

عقل اور مذہب کے بارے میں یہ غیر یقینی موقف اختیار کرنے کی وجہ سے ان دونوں کو نقصان پہنچا۔ اگر مجرد عقل کو رہنما اور ہادی بنا کر مذہب کا جائزہ لیا جاتا تو مذہب خرافات سے یکسر پاک ہو جاتا اور وہ خواہ انسان کے لطیف جذبات کی تسکین کا کوئی سامان فراہم کرتا یا نہ کرتا لیکن عقل کی اس سے ضرور تسلی اور تشفی ہوتی اور آئندہ کے لیے مذہب کے ارتقاء اور ترقی کا ایک راستہ ضرور متعین ہو جاتا۔ لیکن اس معاملے میں یقین اور جزم کے ساتھ کوئی موقف اختیار نہ کرنے کی وجہ سے مذہب نہ تو غیر عقلی عناصر سے پاک ہو سکا اور نہ اس نے روحانی احساسات کی تسکین کے لیے کوئی سامان فراہم کیا۔ اس تحریک نے ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ لوگوں کے فکری جذبات کو بے لنگر کیا اور ان کے احساسات و جذبات میں یکایک طوفان اٹھا دیا لیکن اس کے علمبرداروں میں نہ تو اتنا تدبر تھا اور نہ اتنی ہمت کہ وہ مضطرب ذہنوں کو یقین کی دولت عطا کر سکتے۔ اس کام کے لیے دین کے اندر گہری بصیرت اور سائنس کے اکتشافات نے جو نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے ان کی پوری سمجھ بوجھ اور ان مسائل کو مذہبی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے کی خصوصی مہارت درکار تھی۔ لوتھر اور اس کے متبعین میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس عظیم کام کو سرانجام دینے کی ہمت رکھتا۔ ان کے کارناموں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی گھر کے اندر چند منکرات دیکھ کر لوگوں کو انہیں دور کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن برائی اور بھلائی کے درمیان تمیز نہ کرنے کی وجہ سے انہیں پوری عمارت کو گرانے کا مشورہ دیتا ہے اور بڑے جوش کے ساتھ اسے پیوندِ خاک کر دیتا ہے اور پھر اس خالی زمین کو ان لوگوں کی تحویل میں دے دیتا ہے جو یہاں کھلے بندوں ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

---

[۱] CHARLES BEARD: THE REFORMATION P. 164.

اسلام میں نظامِ احتساب

از: ڈاکٹر اسحٰق موسیٰ الحسینی
ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

وحدتِ فکر اور اس بنیاد پر تنظیمِ جماعت، اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا ہے: جب تین افراد سفر پر روانہ ہوں تو وہ اپنے میں سے ایک کو امیرِ سفر بنالیں، اسی طرح ایک دوسرے مقام پر یوں ہدایت فرمائی: تین ایسے افراد کے لیے یہ بات کسی لحاظ سے مناسب نہیں کہ وہ مسافرت میں ہوں مگر اپنے میں سے کسی ایک کو امیر نہ بنائیں۔ جب نظمِ جماعت اور امارت کی یہ تاکید اتنی قلیل تعداد کے لیے کی گئی ہے، تو کثرتِ افراد کی صورت میں اس حکم کی پیروی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ نمازِ جمعہ کے متعلق دینی احکام ہم پہلے واضح کر چکے ہیں[1]۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جائز ہے کہ خاص خاص صنعتوں کے لیے الگ الگ منڈیاں قائم کی جائیں اور ایک ہی پیشے سے تعلق رکھنے والوں اور ایک ہی نوعیت کے کاروبار کرنے والوں کو ایک تنظیم سے وابستہ کیا جائے۔ اِس ضمن میں محتسب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان تنظیموں کے ارکان میں سے موزوں افراد کو ان کی سربراہی کی ذمہ داری سونپیں اور یہ سربراہ پیشہ ورانہ مہارت، دیانت اور امانت میں، اپنے دوسرے رفقاء میں ممتاز ہونے چاہییں۔ معاشرے کے تنگدست اور مفلوک الحال افراد امراء اور اصحابِ ثروت کے مال اور املاک میں اپنا جائز حق رکھتے ہیں۔ اگر کسی فرد کو کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملے اور وہ پوری کوشش کے باوجود بھی اپنے مقصد میں ناکام

[1] فاضل مصنف نے یہاں جمعہ کی بحث کو پھر دہرایا ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔ (مترجم)

ہو تو اس وقت مُحتسب کو اُس کی اس معاملے میں پُوری پُوری معاونت اور دستگیری کرنی چاہیے اور اس کی رہائش کا انتظام کرنا چاہیے۔ یہ بات صرف رہائش تک ہی محدُود نہیں بلکہ مُحتسب کا فرض ہے کہ وہ اُسے بنیادی ضروریات فراہم کرنے میں پوُری پُوری مدد دے۔ مثلاً سردی سے بچاؤ کے لیے کپڑے، کھانا پکانے کے لیے برتن اور دیگر ضروری سامان ——————

—————— امام ابن تیمیہؒ نے ان امُور میں قرآن مجید کی مندرجۂ ذیل آیت سے استدلال کیا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ - (سورۃ الماعون)

افسوس ہے ایسے نمازیوں پر جو نماز کے متعلق لاپروائی برتتے ہیں، جو دکھاوے کے لیے (اچھے کام کرتے ہیں)، اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں روک رکھتے ہیں۔

اسی بنیاد پر امام موصوف شدید ضرورت کے وقت، کسی دوسرے شخص کی زمین سے، بشرطیکہ اُسے کوئی بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہو، پانی حاصل کرنے کو بالکل جائز قرار دیتے ہیں اور معاشرتی مصالح کے پیشِ نظر تعلیم و تعلم، مسندِ افتاء کے قیام اور شہادت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک وہ صنعتیں جو انسان کو بنیادی ضروریات فراہم کرتی ہیں جیسے کھیتی باڑی، کپڑا بُننا یا تعمیرِ مکانات فرض کفایہ ہیں اور اگر لوگ ان کی طرف کما حقہٗ متوجہ نہ ہوں تو بعض افراد کے لیے ان کاموں کا سرانجام دینا فرضِ عین کی صورت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ ان کے بغیر اجتماعی مصالح پُورے نہیں ہوتے۔ حاکمِ وقت ان صنعتوں کے ماہرین کو جو معاشی فلاح و بہبود کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہیں، چلانے پر مجبور بھی کر سکتا ہے اور اُس صورت میں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے ماہرین کو کم ازکم اتنا معاوضہ ضرور دے جو وہ دوسرے کام سرانجام دے کر حاصل کر رہے ہوں۔ اگر بیت المال میں ہر بستی میں مساجد کی تعمیر، فصیل کی تعمیر، پانی کے خاطر خواہ انتظام کنوؤں اور چشموں کی صفائی اور مسافروں کے لیے مختلف سہولتیں فراہم کرنے

کے لیے سرمایہ کی مناسب مقدار موجود نہ ہو تو پھر ان سارے فرائض کی بجاآوری بستی والوں کے لیے لازمی ہو جاتی ہے اور اگر وہ ضروری فنڈز جمع نہ کر سکتے ہوں تو اُن کا فرض ہے کہ وہ جسمانی محنت کر کے ان اجتماعی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوں۔

اگر محتسب کسی تنومند فقیر کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھے تو اُسے اس سائل کو سرزنش کرنی چاہیے اور اُسے کام کرنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ اگر ترغیب و ترہیب کارگر ثابت نہ ہو رہی ہو تو محتسب اسے سزا دینے کا بھی پُورا پُورا اختیار رکھتا ہے۔ ابی زکریا الحفصی کے عہد میں جب لوگ اندلس سے نکالے گئے اور وہ ٹیونس میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تو ان پُرآشوب حالات میں مُحتسبین نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور صحت مند لوگوں کے لیے مناسب اور معقول روزگار مہیا کیے۔

فلاح و بہبود کے انہی کاموں کو اچھے طریق سے سرانجام دینے سے خوشگوار اجتماعی زندگی کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔ ان کاموں کی نوعیتیں اتنی متعدد اور ان کا دائرہ کار اتنا وسیع ہے کہ ان کا پُوری طرح احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ عائلی زندگی کو بہتر اور پُرسکون بنانے کے لیے محتسب حسبِ ضرورت اولیاء کو نکاحِ بیوگان کے لیے مجبُور کر سکتا ہے۔ عوام کی زندگیوں کو خطرات سے بچانے کے لیے جہاز رانوں کو کشتیوں میں کم وزن لادنے کا حکم دے سکتا ہے پھر اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر اُس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی عزت و آبرُو کی حفاظت و پاسبانی کا انتظام کرے اور فتنہ جُو لوگوں کو عوام کے ذاتی رازوں کے تجسّس اور ان کے اِفشاء سے باز رکھے۔

کسی اسلامی معاشرے میں اجتماعی معاملات کن اصُولوں پر طے کیے جاتے ہیں اُن کی تفصیل نظامِ احتساب کی مختلف کتابوں میں ملتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ سارے معاملات کا عدل و انصاف کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے اور اس ضمن میں لوگوں کے درمیان بلحاظ مذہب، منصب اور جنس کوئی تفریق روا نہ رکھی جائے۔ خلیفہ، قاضی، اربابِ حکومت اور رعایا الغرض سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جائے۔ اور

محتسب ان سارے افراد سے پوری طرح باز پرس کرے اور اس معاملے میں مسلم اور ذمی کے درمیان بھی کوئی امتیاز نہ پیدا ہونے دیا جائے۔

یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے جب راعی اور رعایا دونوں اللہ پر ایمان رکھتے ہوں اور انفرادی اور اجتماعی معاملات کو عدل و انصاف کے ساتھ طے کرنے کے آرزو مند ہوں جب افراد اور اربابِ حکومت لوگوں کی جان و مال اور اُن کی عزت و آبرو کی حفاظت کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہوں اور معیشت کو دیانت اور امانت کی اساس پر قائم کرنے کے متمنی ہوں۔ یہ سارے اصول اور ضابطے ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ شریعت نے نہایت واضح الفاظ میں ان کی نشاندہی کی ہے۔ اسی وجہ سے شیزری نے بالکل صحیح کہا ہے کہ نظامِ احتساب کے اصول و ضوابط شریعتِ اسلامی سے مستنبط ہیں محتسب کا فرض ہے کہ اسلام جن بھلائیوں کو فروغ دینا چاہتا ہے انہیں پھیلانے کے لیے پوری طرح جدوجہد کرے اور ان بُرائیوں کو مٹانے کی فکر کرے جنہیں دینِ حق دنیا سے مٹانے کا حکم دیتا ہے محتسب کی ذمہ داریاں بڑی نازک ہیں اور وہ دین کے اندر گہرا علم اور تفقُّہ حاصل کیے بغیر کبھی بھی ان سے بطریقِ احسن عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ عالم اور فقیہ ہونے کے ساتھ ایک کامیاب محتسب کے لیے آزاد صاحب الرائے، صاف گو اور دین میں پختہ ہونا بھی ضروری ہے۔

محتسب پر جن منکرات کے دُور کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اُن کا تعلق بیع و شریٰ کے معاملات سے بھی ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو کھانے پینے کی اشیاء ذخیرہ کرنے سے روکے اور ذخیرہ اندوزوں کو اپنا مال منڈی میں لانے پر مجبور کرے۔ پھر اس پر یہ بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اُن لوگوں کا سختی سے احتساب کرے جو دھوکے اور فریب سے اپنے مال کے نقائص چھپا کر اُسے بیچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس فریب کاری سے معاشرے کو بچانے کے لیے قوانین اور ضابطے بھی وضع کرے۔ مثال کے طور پر درزی کی

خیانت سے معاشرے کو مامون رکھنے کے لیے اگر یہ اصول بنا دیا جائے کہ وہ نہ صرف پیمائش کے لحاظ سے، بلکہ وزن کے اعتبار سے بھی کپڑا سلوانے والے کو ان کا پورا کپڑا واپس کرے تو اس سے بہت سے لوگ درزیوں کی دستبرد سے بچ جائیں گے۔ اسی طرح قصاب کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ بھیڑ کے گوشت کو بکری کے گوشت سے الگ رکھے تاکہ لوگ دھوکہ میں نہ آئیں۔ اسی طرح پرانی اور نئی روئی کو آپس میں خلط ملط نہ ہونے دیا جائے۔ مال بیچنے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ لوہے کے معیاری پیمانے اور اوزان استعمال کریں تاکہ وہ اشیاء کی پیمائش کرتے وقت یا انہیں تولتے وقت کسی فریب کا شکار نہ ہو سکیں۔ زرگروں پر یہ پابندی عائد کرنا ضروری ہے کہ وہ زیور کے خریداروں کو کھوٹ کی مقدار سے بھی آشنا کریں اور زیور بیچنے والے کی موجودگی میں ہی انہیں بھٹی میں ڈال کر گلائیں۔

اگر محتسب کبھی محسوس کرے کہ شہروں کی بڑھتی آبادی کی وسیع تجارت کا وہ از خود پوری طرح احتساب نہیں کر سکتا تو ایسے حالات میں اسے ایماندار افراد کو اس کام کے لیے تعینات کرنا چاہیے تاکہ وہ ماپ تول اور اسی نوعیت کے دیگر معاملات میں اس کی نیابت کا حق پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کر سکیں۔

پھر محتسب کو اس بات کی بھی کڑی نگرانی کرنی چاہیے کہ کسی پیشہ یا کاروبار میں صرف وہی لوگ شریک ہوں جو اس کے متعلق ایک طرف تو عملی واقفیت رکھتے ہوں اور دوسری طرف اس کے بارے میں شرعی احکام کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ چنانچہ بزاز کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کپڑے کی مختلف اقسام کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ اس کی خرید و فروخت کے طریقوں اور ان کے بارے میں شرعی حدود و قیود سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقع پر اس امر کی ہدایت صادر فرماتے ہوئے کہا:

"ہماری منڈیوں میں صرف وہی لوگ تجارت کرنے کے حقدار ہیں جو دین میں سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔"

یہ حکم بزاز کے لیے ہی مخصوص نہیں بلکہ صرّاف، طبیب سب کے لیے اس کی پابندی لازمی ہے۔ محتسب کی دیگر ذمہ داریوں میں ایک بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اطباء کا امتحان لیتا رہے اور اُس شخص کو جو اعصاب، شریانوں، مفاصل اور ہڈیوں کے متعلق پوری پوری واقفیت نہ رکھتا ہو، فصد کی اجازت نہ دے۔ اُسے طبیبوں سے یہ عہد بھی لینا چاہیے کہ وہ کسی مریض کو مضرِ صحت دوائی نہ دیں اور زہریلے مرکبات تیار کر کے لوگوں کے ہاتھ فروخت نہ کریں۔ انہیں چاہیے کہ وہ خواہ مخواہ طب کے ایسے راز افشاء نہ کرتے پھریں جن سے اناڑیوں کو عوام سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا موقع مل سکے۔

امام ابن تیمیہؒ نے حالات اور ضرورت کے تحت اشیاء کا کنٹرول بھی ضروری قرار دیا ہے۔ مثلاً اگر ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے والے عوام کی مجبوری کے پیش نظر جائز قیمتوں سے بڑھ کر دام وصول کرنے لگیں۔ خصوصاً کھانے پینے کی اشیاء جن پر زندگی کا دارومدار ہے، تو ایسے حالات میں حکومت کو لازماً قیمتوں پر کنٹرول کرنا چاہیے۔ اسی طرح اگر جہاد میں اسلحہ کی ضرورت درپیش ہو اور اسلحہ کے تاجر اُسے معقول اور مناسب قیمتوں پر فروخت کرنے میں متامل نظر آتے ہوں تو حکومت کو قیمتوں کا از خود تعین کر دینا چاہیے۔

احتساب کے ضمن میں انسان کے ذہن میں ایک سوال بالکل فطری طور پر اُبھرتا ہے کہ جب فریب کاری کی روک تھام کے لیے اتنا منظم شعبہ موجود تھا تو یہ مرض معاشرہ میں کس طرح سرایت کرنے میں کامیاب ہُوا۔ فلسفۂ تاریخ کے علماء نے اسے بہت سے اسباب کا نتیجہ قرار دیا ہے جنہیں نہایت اختصار کے ساتھ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) جب شہری آبادی حد سے زیادہ بڑھ گئی اور کثرتِ افراد کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبہ پر احتساب مشکل ہو گیا اور دوسرے شہروں اور ممالک سے آکر لوگوں نے تجارت شروع کی تو ان حالات میں محتسب ان کے کاموں کی پوری طرح نگرانی نہ کر سکا۔ چنانچہ شیزری نے عطاروں کی فریب کاریوں پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کام کی جرأت زیادہ تر باہر سے آنے والے

تاجر اور گلی کوچوں میں گھوم پھر کر بیچنے والے سوداگری کرتے ہیں محتسب کے لیے ان سب کا محاسبہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اصل عربوں نے صنعت و حرفت کو گھٹیا کام سمجھ کر اُس سے صرفِ نظر کرنا شروع کیا اور یہ شعبۂ حیات آہستہ آہستہ غیر مسلموں خصوصًا یہودیوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

(۳) جب معاشرے میں مال و دولت کی فراوانی ہوا ور عوام کے اندر زندگی کے معیار کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کا جذبہ موجزن ہو تو پھر وہ حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر دولت جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

(۴) جب سوسائٹی میں رشوت کی گرم بازاری ہوئی تو محتسب کا معزز عہدہ بھی بکنے لگا اور حکمرانوں کو اس کی بداعمالیوں سے مجبورًا اغماض برتنا پڑا۔ پھر محتسب اپنے اصل فرائض سے یکسر غافل ہو کر صرف مال و متاع سمیٹنے میں منہمک ہو گئے۔

(۵) اس اخلاقی انحطاط کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اسلامی سلطنت کی حُدود تو مسلسل پھیلتی چلی گئیں مگر لوگوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ کیا گیا۔ اس بنا پر مُسلم سوسائٹی میں وہ وحدتِ فکر باقی نہ رہی جو اخلاقی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھی۔ معاشرے کے اندر بعض باطل خیالات اور گمراہ کُن تصورات نے راہ پائی اور اس طرح وہ مختلف طبقات میں بٹ کر رہ گیا۔ پھر ان طبقات کے درمیان سر پھٹول شروع ہوئی۔

(۶) بسا اوقات طالع آزما اور حریص تاجروں نے آفات آسمانی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ناپاک کوشش کی۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ سیلاب اور قحط کی وجہ سے سامانِ زیست کمیاب ہو گیا ہے تو انہوں نے اس کی فروخت روک دی اور مال جب اور زیادہ مہنگا ہُوا تو پھر اس کی فروخت سے بہت زیادہ دام وصول کیے۔

اسلامی معاشرے میں فریب کاری نے کن طریقوں سے راہ پائی اس کے بارے میں کوئی

چیز بھی پورے یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ مندرجۂ بالا وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ یا ساری وجوہات اس کی ذمہ دار ہوں۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مومن و مسلم جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اچھی طرح پہچانتا ہے وہ اس جرم کا بیان بوجھ کر ارتکاب نہیں کرسکتا۔ حضور سرور دو عالم نے فرمایا ہے: "جس نے ہمیں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہوسکتا۔"

فریب کاری کی نوعیتیں ماحول کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ شہروں میں جہاں آبادی گنجان ہو، اس کا دیہات کی بہ نسبت زیادہ چلن ہوتا ہے۔ پھر زراعت کی بہ نسبت صنعت و حرفت میں اس کے زیادہ امکانات موجود رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا اُن بستیوں میں زیادہ دور دورہ ہوتا ہے جہاں مسافروں کے آنے جانے کی کوئی پابندی نہ ہو اور ہر شخص خواہش کے مطابق وہاں سکونت اختیار کرسکتا ہو۔

بات ختم کرنے سے پہلے ہم ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں: "کیا مسلمانوں نے احتساب کا یہ نظام بازنطینیوں سے مستعار لے کر اُسے اسلامی رنگ دیا ہے یا یہ اُن کی اپنی تہذیب ہی کا ایک ضروری حصہ ہے؟"

مشہور مستشرق GUSTAV VON GRUNEBAUN نے اپنی کتاب MEDIEVAL ISLAM میں اسلامی نظامِ احتساب اور بازنطینی نظامِ احتساب کا موازنہ کرکے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں نے اسے بازنطینیوں سے مستعار لیا ہے۔ البتہ اس میں حالات کے مطابق کچھ تبدیلیاں ضرور کی ہیں۔

ہم نے اُن ساری کتابوں کا جو اسلامی نظامِ احتساب سے بحث کرتی ہیں دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور پھر بازنطینی کتاب BOOK OF PERFECT سے اچھی طرح مقابلہ کرکے دیکھا ہے لیکن ہمیں اس دعویٰ میں کوئی صداقت نظر نہیں آئی۔ ہم اس دعوے کو مندرجۂ ذیل وجوہ کی بنا پر غلط سمجھتے ہیں:

اوّلاً، بازنطینی تصنیف "کتابِ کامل" دسویں صدی عیسوی میں مرتب کی گئی۔ اس کے مقابلے میں اسلامی نظامِ احتساب پر اگرچہ مستند تصنیفات دوسری صدی ہجری کے آخر یا تیسری صدی کے آغاز میں معرضِ وجود میں آئیں لیکن ان کتب کے اصول و مبادی اس سے بہت پہلے قرآن مجید، سنتِ رسول ؐ اور خلفائے راشدین کے آثار کی بنیاد پر طے ہو چکے تھے۔ یعنی بازنطینی کتاب کی تدوین سے قریب قریب دو سو سال پیشتر۔

ثانیاً، "کتابِ کامل" کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہے:

"اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام اشیاء کو پیدا کیا اور بنی نوع انسان کے لیے امن اور تعاون کی ضمانت دے دی۔ اس نے الواح (تختیوں) پر اپنی انگلی سے "قانون" ثبت فرما دیا۔ پھر اس کی اشاعت فرمائی تاکہ لوگ ہدایت حاصل کرنے کے بعد ایک دوسرے کے حقوق کو پامال نہ کریں اور طاقتور کمزور پر دست درازی نہ کر سکیں بلکہ تمام امور اپنے مقررہ نظام کے مطابق انجام پاتے رہیں۔"

یہ عبارت ایک عادلانہ اور حکیمانہ قانون کے وجود پر صاف دلالت کرتی ہے۔ انجیل میں ایسا کوئی قانون موجود نہیں جو امورِ سلطنت سے براہِ راست بحث کرے۔ یہاں خدا کا حصّہ قیصر کے حصّے سے بالکل الگ ہے۔ میرے نزدیک مندرجۂ بالا جملے کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ اس کے پیچھے اسلامی ذہن کارفرما ہے۔

ثالثاً، "کتابِ کامل" دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصّے میں حرفت، ریشمی کپڑوں کی تجارت، خام ریشم کی تیاری، سوتی کپڑوں، عطر، خوشبودار تیل، صابن بنانے کے مختلف طریقوں، چمڑہ رنگنے اور دکانداری کے اصول سے بحث کی گئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے اس حصہ پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

دوسرا حصّہ اشیاءِ خوردنی، مثلاً مچھلی، گوشت اور روٹی کی خرید و فروخت، جانوروں کی

منڈیوں کی نگرانی کے متعلق رہنمائی دیتا ہے۔ کتاب کا پہلا حصّہ جس میں مصنّف نے پوری پوری ذہانت دکھائی ہے، اُن امور سے متعلق ہے جو صرف طبقۂ امراء کی دلچسپی کا موجب ہیں۔ اسلام میں نظامِ احتساب کا مرکز و محور عوامی مسائل ہیں جیسے غذا اور لباس کا مہیا کرنا، مساجد اور منڈیوں کی تعمیر۔ یہ بنیادی فرق اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اسلام میں نظامِ احتساب اپنے مزاج اور مقصد کے اعتبار سے بازنطینی احتساب سے بالکل مختلف ہے۔

رابعاً، بازنطینی کتاب میں عبادات اور اصلاحِ اخلاق کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام کا پورا نظامِ احتساب حقوق اللہ کی اساس پر قائم ہے اور محتسب کو انہیں حقوق کی صحیح طور پر بجا آوری کا حکم دیا گیا ہے۔ مسلمان حکماء میں سے جن حضرات نے بھی احتساب کے بارے میں کچھ لکھا ہے وہ سارے اس بات پر متفق ہیں کہ یہ نظام دین ہی کا ایک ضروری شعبہ ہے اور شریعت نے اس کے اصول متعیّن کیے ہیں۔

خامساً، یہ کتاب کامل" میں تجارت اور کاروباری معاملات میں یہودیوں اور غلاموں پر خاص خاص پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ اسلامی نظامِ احتساب ان معاملات میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتا اور یہ کوئی مسلمان حکمرانوں کا احسان نہیں بلکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ غیر مسلم اسلامی ریاست میں اپنے آپ کو کس قدر مامون و محفوظ سمجھتے تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب عیسائیوں نے یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا تو انہوں نے مسلمان حکومت میں بڑے اعتماد کے ساتھ پناہ لی۔

یہ سب حقائق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ اسلامی نظامِ احتساب اپنے مقصد، منہاج اور اصولوں کے اعتبار سے بازنطینی احتساب سے یکسر مختلف ہے اور اسی بنا پر اس دعوے میں معمولی سی صداقت بھی نہیں کہ اسلامی نظامِ احتساب بازنطینی احتساب کا چربہ ہے۔ البتہ ہم اس امر کی صراحت ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے انسانی تہذیب و تمدن کے پہلوؤں کو اپنانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے حکمت و دانائی کی ہر بات کو مسلمان کی گمشدہ متاع سمجھ کر اُسے پورے اشتیاق سے حاصل کرنے کی کوشش کی یہی صورت ہمیں نظامِ احتساب کے معاملے میں بھی نظر آتی ہے۔ (بشکریہ المسلمون)

رابطۂ عالمِ اسلامی کی قراردادیں

رابطہ کی مجلس اساسی کا ساتواں اجلاس جو ۲۷ ذی القعدہ سے ۲۲ ذی الحجہ ۸۵ھ (۱۹ مارچ سے ۱۲ اپریل ۱۹۶۶ء) تک مکہ مکرمہ میں زیرِ صدارت شیخ محمد بن ابراہیم (مفتی اکبر مملکت سعودیہ) منعقد ہوا تھا۔ اس میں حسبِ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

۱۔ قضیۂ فلسطین مجلسِ اساسی اس باب میں اپنی سابقہ قراردادوں کی پھر تجدید کرتی ہے کہ فلسطین کے لوگوں کو اپنے ملک میں پورا پورا حق خود اختیاری ملنا چاہیے، اور جو کچھ بھی صہیونی تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے وہ کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا۔ حال میں بعض عرب ممالک نے اپنے ہمسایہ اسلامی ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھانے کی جو کوشش کی ہے اور خاص طور پر ترکی اور ایران سے جو خوشگوار تعلقات پیدا کیے ہیں، یہ مجلس ان کو نہایت خوش آئند سمجھتی ہے اور امید رکھتی ہے کہ من جملہ دوسرے فوائد کے ان کا یہ فائدہ بھی ہو گا کہ قضیۂ فلسطین قومیتِ عربیہ کے تنگ دائرے سے نکل کر عالمِ اسلامی کے وسیع دائرے کا مسئلہ بن جائے گا جس کی ضرورت یہ مجلس ایک مدت سے محسوس کر رہی تھی۔

مجلسِ اساسی عربی اور اسلامی ممالک سے توقع رکھتی ہے کہ وہ آپس میں ہر طرح کے لڑائی جھگڑے اور مخالفت کو کلیتہً ختم کر دیں گے اور افہام و تفہیم کا دامن تھامیں گے۔ یہ ان کے مشترکہ مسائل کی خدمت ہو گی اور خاص طور پر قضیۂ فلسطین کی جو درحقیقت عالمِ اسلام کا مسئلہ نمبر ایک ہے۔

یہ مجلس تمام مسلم اور عرب ممالک سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں اور فلسطینی عوام کو ان کا عادلانہ حق دلانے کے لیے جلد از جلد عملی اقدام کریں، کیونکہ

حالات روز بروز صیہونی ظلم کے حق میں جا رہے ہیں اور مسئلۂ فلسطین کو نقصان پہنچ رہا ہے

۲۔ سربراہانِ عالمِ اسلام کی کانفرنس

مکۂ مکرمہ کی دوسری مؤتمر اسلامی منعقدہ ۱۳۸۴ھ میں سربراہانِ عالم اسلامی کی کانفرنس اور اس کی ضرورت کے بارے میں جو قراردادیں پاس کی گئی تھیں ان کے بارے میں رابطہ کے سیکرٹریٹ کی رپورٹ مجلس کے سامنے پیش ہوئی اور مجلس کو یہ معلوم کر کے نہایت اطمینان ہوا کہ ایسی ایک کانفرنس منعقد کرنے کے لیے اب تک کیا اقدامات کیے گئے ہیں جس میں اعلیٰ سطح پر عالم اسلامی کے سربراہانِ مملکت جمع ہو کر مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات کا حل سوچیں اور مسلمان قوموں کے درمیان اتحاد و تعاون کی کوئی عملی صورت طے کریں۔

مجلس اساسی شاہ فیصل کی شکر گزار ہے کہ انہوں نے مؤتمر کی اس تجویز کی تائید و حمایت کی اور اُن سربراہانِ عالمِ اسلامی کا بھی شکریہ ادا کرتی ہے جنہوں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔

مجلس اس بات پر بھی بڑی خوشی کا اظہار کرتی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے عموماً اس تجویز کو بہت پسند کیا ہے اور ہر طرف سے اس تجویز کی تائید میں آواز اٹھائی ہے۔ تمام اطراف و اکنافِ عالم کے مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی اتحاد ہی وہ راستہ ہے جس سے مسلمان دشمنوں کے مکر و کید سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں اور اُن بیرونی اثرات کے مقابلے میں عالم اسلامی کی حفاظت کر سکتے ہیں جو اخلاقی بگاڑ اور تباہ کُن عقائد و نظریات کا ایک سیلاب مسلمان ملکوں میں لا رہے ہیں تاکہ مسلم معاشرے کی بنیادوں کو متزلزل کر کے انہیں استعماری طاقتوں کے لیے آسان شکار بنا دیں۔

مجلس اساسی اس بات کو پھر دہراتی ہے کہ اتحاد عالم اسلامی کی تحریک کسی ایک فرد یا کسی ایک حکومت کی جانب سے نہیں کی گئی ہے، اور اس خیال سے تو اُسے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے کہ کسی کے خلاف اتحاد کیا جائے یا یہ اتحاد کسی کے لیے چیلنج ہو۔ یہ تو

درحقیقت اِس امر کی ایک مخلصانہ کوشش ہے کہ اسلامی ممالک کی حکومتوں کے درمیان اتفاق کی فضا پیدا کی جائے اور اِن ممالک کی اجتماعی زندگی کو اسلام کی بتائی ہوئی بنیادوں کے مطابق استوار کیا جائے تاکہ مستقبل میں ایسے لوگ انسانیت کی خدمت کریں جو اللہ پر صحیح ایمان رکھتے ہوں، اور نوعِ انسانی کے لیے امن و سلامتی کے باعث بنیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جب دنیا میں صرف متشابہ نظریات رکھنے والی قومیں ہی نہیں بلکہ متصادم نظریات کی حامل قومیں بھی اپنی بھلائی اور ترقی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی راہیں نکال رہی ہیں تو ہم مسلمانوں کے درمیان ایسا تعاون پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں؟ ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان یہ تعاون سب سے زیادہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنایا ہے اور یہ اخوت ہمارے ایمان کے تقاضوں میں سے ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ان هٰذہ امتکم امة واحدة، اور انما المومنون اخوة۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضًا۔ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیمات قطعی طور پر یہ طے کر دیتی ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان اصل تعلق ہمدردی اور تعاون ہی کا تعلق ہے اور ان کا باہمی تفرقہ و اختلاف ایک عارضی حالت ہے جو دین سے دُوری اور استعماری سیاست کی تدبیروں کے باعث ان پر طاری ہو گئی ہے۔ ہم سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم متفقہ جدوجہد سے حالات کو پھر سے اُن کے اصلی رُخ کی طرف پلٹائے جائیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

اس کانفرنس کے سلسلے میں مجلس اساسی کی تجاویز حسبِ ذیل ہیں:

کانفرنس مکہ معظمہ میں منعقد ہونی چاہیے، اس لیے کہ یہ وحی الٰہی کے نازل ہونے کا مقام بھی ہے اور روحانی برکات کا منبع بھی۔

اس کا انعقاد ایامِ حج کے ماسوا دوسرے کسی قریب ترین ممکن وقت میں ہونا چاہیے۔

مجلسِ اساسی کی رائے میں من جملہ دوسرے امور کے جو شریک ہونے والے سربراہانِ مملکت زیرِ بحث لانا مناسب سمجھیں، حسبِ ذیل امور پر بھی توجہ کی جانی چاہیے:

۱۔ مسلم ممالک کے درمیان تعاون کی مختلف صورتوں کے امکانات کا جائزہ تاکہ مشترکہ مقاصد و مصالح کے لیے مل کر کام کیا جا سکے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اسلامی اخوت کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو سکیں۔

۲۔ عالمی امن کی حفاظت اور قوموں کے اخلاقی اور اجتماعی معیارِ حیات کی بلندی اور ایٹمی ہتھیاروں کی روک تھام کے لیے مسلم ممالک کی متحدہ سعی۔

۳۔ دنیا کی قوموں کو بے جا استحصال سے بچانے اور استعمار کی مختلف شکلوں سے ان کو نجات دلانے کی کوشش اور مظلوم قوموں کی حمایت۔

۴۔ اسلامی فکر کے احیاء اور اسلام کی بنیادوں پر مسلم معاشرے کی تعمیر کے لیے عملی تدابیر اور وسائل کا جائزہ۔

۵۔ کانفرنس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک انتظامی مشنیری کا قیام۔

۶۔ ایک ایسے ادارے کا قیام جو مسلم ممالک کے درمیان رونما ہو جانے والے اختلافات کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم کی روشنی میں رفع کرائے۔

۳۔ تبلیغِ اسلام مجلسِ اساسی شاہ فیصل کا اس بات پر شکریہ ادا کرتی ہے کہ پچھلے سال مؤتمر کے اجلاس عام نے جن ملکوں میں خاص طور پر تبلیغ اسلام کا انتظام کرنے کی ضرورت ظاہر کی تھی، انہوں نے اس کے لیے مالی مدد دینا قبول فرما لیا ہے اور مملکت سعودیہ کے بجٹ میں اس کے لیے رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔

۴۔ ریڈیو "صوت الاسلام" (مکہ) کے بارے میں مجلسِ اساسی مکۂ معظمہ کے ریڈیو صوت الاسلام کے بارے میں حسبِ ذیل تجاویز پیش کرتی ہے:

(۱) اس ریڈیو سٹیشن کو اتنا قوی کر دیا جائے کہ اس کی آواز سارے اسلامی ممالک میں آسانی سنائی دے سکے۔

(۲) وزارتِ اطلاعات میں ممتاز اصحابِ علم و دانش کی ایک خاص کمیٹی بنائی جائے جو اسلامی نشریات کے پروگراموں کی نگرانی کرے اور رابطۂ عالم اسلامی کا ایک نمائندہ بھی اس میں لیا جائے۔

(۳) مناسب اوقات پر ان نشریات کے لیے اوسطاً روزانہ ۳ گھنٹے صرف کیے جائیں۔

(۴) عربی کے علاوہ اسلامی ممالک کی دوسری بڑی بڑی زبانوں میں بھی اسلامی پروگرام نشر کیا جائے۔

۵ - مجمع فقہ اسلامی

مجلس اساسی نے مؤتمر اسلامی کے گذشتہ اجلاس عام کی تیسری قرارداد پر بھی غور کیا جس میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ عالم اسلامی کے محقق علماء و فقہاء پر مشتمل ایک مجلس بنائی جائے جو موجودہ زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے پیش آنے والے اسلامی مسائل پر بحث کرے اور کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ اور معتبر فقہی مآخذ کی روشنی میں ان مشکلات کا حل تلاش کرے جن سے دورِ حاضر کے مسلمان دوچار ہیں۔

اس غرض کے لیے مفتیٔ اکبر جناب شیخ محمد بن ابراہیم کی صدارت میں مندرجۂ ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جو اس منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے مفصل رپورٹ پیش کرے گی:

۱ - مولانا ابوالحسن علی ندوی	بھارت
۲ - مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	پاکستان
۳ - شیخ محمد الحرکان	سعودی عرب
۴ - شیخ محمد محمود الصواف	عراق
۵ - شیخ محمد الفاضل بن عاشور	تونس

۶۔ شیخ عبدالعزیز بن باز وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی

۶۔ منیٰ کی زمینیں

حجاج کی کثرت کی وجہ سے منیٰ بہت تنگ ہوگیا ہے، اور مزید تنگی اس لیے ہوگئی ہے کہ لوگوں نے وہاں کثرت سے مکانات بنا لیے ہیں، جنہیں وہ بہت بھاری کرایوں پر حجاج کو دیتے ہیں۔ اس لیے منیٰ کی زمینوں کے بارے میں مجلس کے سامنے جو مسائل زیرِ بحث آئے ان کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

(۱) حدودِ منیٰ۔ فقہاء نے حدودِ منیٰ کو متعین کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک طرف جمرۂ عقبہ اور وادیٔ مُحَسَّر کے درمیان اور دوسری جانب جبل ثَبیر اور جبل الصالح کا درمیانی علاقہ منیٰ ہے۔ اِن حدود کے باہر جو علاقہ ہے وہ منیٰ میں شمار نہ ہوگا اور اس میں رات گزارنے سے منیٰ میں شب بسر کرنے کا حکم پورا نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے اعلان کیا تھا کہ کوئی حاجی عَقَبہ کے باہر رات نہ گزارے، اور وہ چند آدمیوں کو اس کام پر مامور کر دیتے تھے کہ حاجیوں کو عَقَبہ کے دوسری جانب سے ہٹا کر منیٰ کے حدود میں لے آئیں۔

(۲) منیٰ کی عمارتیں۔ منیٰ میں کوئی عمارت نہیں بنائی جاسکتی اور نہ کوئی شخص اس کی زمینوں کا مالک ہوسکتا ہے۔ یہ حکم حدیث میں صاف وارد ہُوا ہے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ ان عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت یا رسول اللہ الا نبنی لک بیتًا یظلک بمنیٰ۔ قال لا۔ منیٰ مناخ من سبق "حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کے لیے منیٰ میں ایک مکان کیوں نہ تعمیر کر دیں جس کے سایہ میں آپ قیام فرمائیں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں، منیٰ تو ہر اس شخص کا ٹھکانا ہے جو پہلے وہاں پہنچ جائے"۔ ابنِ ماجہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تبنوا لی بیتًا بمنیٰ "میرے لیے منیٰ میں کوئی مکان نہ بناؤ"۔ انہی روایات سے استدلال کرتے ہوئے ابن قیم کہتے ہیں کہ منیٰ میں سب کا حق مشترک ہے، جو بھی پہلے وہاں پہنچ کر کسی جگہ پر اتر جائے وہ اس جگہ ٹھیرنے کا زیادہ حق دار ہے جب تک وہ وہاں سے روانہ نہ ہو جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے

متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے منیٰ کے اندر تعمیر شدہ مکانات کو گرا دینے کا حکم دے دیا تھا۔
(۳) منیٰ کی بالائی فضا کا حکم۔ منیٰ میں زمین سے آسمان تک کی فضا اور زمین کی سطح کا حکم وہی ہے جو منیٰ کا ہے۔ کتب فقہ میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص کسی زمین کا مالک ہو وہ اس کی فضا کا بھی مالک ہوگا۔ اس لیے منیٰ کی زمین کی طرح اس کی بالائی فضا بھی مسلمانوں کے لیے وقفِ عام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ "من احیا ارضاً میتۃ فھی لہ ولیس لعرق ظالم حق"۔ جس نے کسی ویران زمین کو آباد کیا وہ زمین اسی کی ہے، ظالم کے لیے اس میں کوئی حق نہیں"۔
(۴) منیٰ کے پہاڑ۔ فقہاء کا قول ہے اور امام نووی نے اس کی تصریح کی ہے کہ منیٰ کے اطراف میں جو پہاڑ ہیں ان کا وہ رُخ جو منیٰ کی جانب ہے منیٰ کہلائے گا۔ اور ان کی پچھلی طرف منیٰ میں شمار نہ ہوگی۔
اِن احکام کی بنا پر منیٰ کی اراضی کے بارے میں مجلسِ اساسی نے مندرجہ ذیل امور طے کیے:
۱۔ جب یہ بات متفق علیہ ہے کہ جبلِ ثبیر اور جبل الصابح کا منیٰ کی جانب والا حصہ منیٰ ہی کہلائے گا، بلکہ ان کی چوٹیوں تک کا حصہ بھی منیٰ ہے تو مجلسِ اساسی کی رائے میں ان پہاڑوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ان پہاڑوں پر آسانی سے آمد و رفت کے لیے سیڑھیاں اور سڑکیں بنا دی جائیں، تاکہ حاجی وہاں ٹھیر سکیں۔ حکومت کو چاہیے کہ ماہرینِ تعمیرات کی ایک کمیٹی تشکیل دے جو اس تجویز کو روبعمل لانے کے امکانات کا جائزہ لے۔
۲۔ جمراتِ ثلاثہ پر کنکریاں پھینکنے کے اوقات میں جو زبردست اژدحام ہو جاتا ہے، جس میں بعض جانیں تک تلف ہو جاتی ہیں اس کی وجہ وہ مکانات ہیں جو وہاں بن گئے ہیں، کیونکہ انہی کے باعث راستے تنگ ہو گئے ہیں اور جس سے حاجیوں کو آمد و رفت میں سخت دقت پیش آتی ہے۔ اس لیے مجلس اساسی کی رائے یہ ہے:
(۱) ضروری ہے کہ اوّلین فرصت میں یہ عمارتیں گرا دی جائیں، خصوصاً وہ عمارات جو جمرۂ

عقبہ اور جمرۂ وسطیٰ کے درمیان ہیں۔

ب۔ جمرۂ اولیٰ کے اردگرد کے علاقے کو وسیع کر دیا جائے تاکہ کنکریاں مارنے کے وقت حاجیوں کی نقل و حرکت میں سہولت ہو جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جمرۂ اولیٰ کے قریب جو تین عمارتیں ہیں ان کا اتنا حصہ توڑ دیا جائے جو توسیع کے لیے کافی ہو۔

ج۔ آل الشیبی کے مکان (الجوھرۃ) کے سامنے والی عمارت سے لے کر منیٰ کے آخر تک شارع عام کی مناسب حد تک توسیع کر دی جائے تاکہ ایک طرف سے دوسری طرف تک کا پورا منظر آدمی کو بخطِ مستقیم نظر آسکے۔ اس غرض کے لیے سڑک کے دائیں جانب والی ساری عمارتیں گرادی جائیں۔

۳۔ شارع عام دوہری بنائی جائے جس پر آنے اور جانے کے راستے الگ الگ ہوں، اور بعد میں اس سڑک کو مسقف کر دیا جائے تاکہ حاجی رمی جمرات کے دوران آتے جاتے گرمی کی تپش سے محفوظ رہ سکیں۔

۴۔ رہیں منیٰ کی باقی عمارات تو ان کے لیے مجلس کی رائے یہ ہے کہ علماء اور اہلِ فن کی ایک کمیٹی بنا دی جائے جو اس پر غور کرے کہ مصلحتِ عامہ اور احکامِ شرعیہ کی روشنی میں ان عمارات کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔

۵۔ منیٰ کے تنگ ہو جانے کا ایک اور سبب یہ ہے کہ حج کے موقع پر خالی زمینوں کی تقسیم میں مختلف لوگوں کی ضروریات کا ٹھیک جائزہ نہیں لیا جاتا اور بعض لوگ اپنی ضرورت سے زیادہ جگہ پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ اس لیے مجلس کی رائے میں خالی اراضی کو تقسیم کرنے والی کمیٹی کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ بے جا تصرفات کو روکے اور ہر ایک کو صرف اس کی ضرورت کے مطابق زمین دے۔

۶۔ مجلس کی رائے میں جدید تعمیرات بالکل ممنوع قرار دے دی جائیں، بجز اس صورت کے جس کا ذکر ہم آگے نمبر ۷ میں کر رہے ہیں۔

۷۔ مجلس کی رائے میں منیٰ کو وسیع کرنا اشد ضروری ہے۔ اس غرض کے لیے یہ مجلس فرمانروئے وقت کو جن پر مشاعرِ دینیہ اور مسلمانوں کے مصالحِ عامّہ کی حفاظت کی اوّلین ذمہ داری عائد ہوتی ہے، یہ مشورہ دیتی ہے کہ وہ منیٰ میں حسبِ ضرورت پختہ سیمنٹ کی کئی منزلہ عمارتیں تعمیر کرانے کی منظوری دیں جن کا نیچے کا حصّہ بالکل کھلا ہو (یعنی ستونوں پر عمارتیں بنائی جائیں) اور اس میں حاجی بغیر کسی معاوضہ کے ٹھیر سکیں۔ رہے اوپر کے حصّے، تو وہ وقف تو حاجیوں ہی کے لیے ہوں، مگر ان کو حکومت کی نگرانی میں ایسے مناسب کرائے پر دیا جائے جو ان عمارات کی مرمت و اصلاح اور دیکھ بھال کے لیے کافی ہو اور ان سے جو زائد آمدنی بچ رہے وہ حج ہی کی ضروریات کے لیے استعمال کی جائے۔ اس طرح کی عمارات ابتداءً ان پہاڑوں پر بنائی جائیں جو بحالتِ موجودہ حاجیوں سے خالی رہتے ہیں، اور جب یہ اسکیم کامیاب ہو جائے تو پھر بتدریج منیٰ کے باقی ماندہ حصّوں میں بھی ایسی تعمیرات کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ (صدرِ مجلس نے منیٰ میں تعمیرات کی اجازت سے اختلاف کا حق اپنے لیے محفوظ رکھا ہے)۔

۸۔ مجلس کی رائے میں یہ مناسب ہوگا کہ کسی قسم کی توسیع اور تعمیر شروع کرنے سے پہلے ماہرینِ فن کی ایک کمیٹی اس غرض کے لیے مقرر کی جائے کہ وہ ان تمام اصلاحات کا ایک منصوبہ بنائے جو منیٰ میں پانی، بجلی، روشنی، ٹیلیفون اور دوسری سہولتوں کی بہم رسانی کے لیے مطلوب ہیں، تاکہ آئندہ تعمیرات میں ان کو ملحوظ رکھا جا سکے اور تمام اصلاحات ایک سوچے سمجھے نقشے پر ہوں۔

۷۔ قربانی کے گوشت کا انتظام

مجلس نے قربانیوں کے گوشت اور اس سے استفادے کے مسئلے پر بھی احکامِ شریعت کی روشنی میں غور کیا اور اس کے جملہ پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد مجلس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ شرعی مصلحت حسبِ ذیل تدابیر کو عملی جامہ پہنانے کی مقتضی ہے:

۱۔ منیٰ کے اطراف میں متعدد مقامات پر بقدرِ حاجت مذبحے بنا دیئے جائیں۔ اُن میں پانی، بجلی، سائے اور صفائی کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے، کھالیں اتارنے کے لیے جدید آلات

نصب کیے جائیں، اور جو گوشت قربانی کرنے والوں اور فقراء میں تقسیم ہونے کے بعد بچ رہے اُس کو سرد خانوں میں رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ ہر حاجی کو اس امر کی پُوری سہولت بہم پہنچائی جائے کہ وہ اپنے جانور کو ذبح کر کے جتنا گوشت لینا چاہے مذبح ہی سے حاصل کر سکے تاکہ حجاج کی قیام گاہوں میں گندگی نہ پھیلنے پائے۔ نیز یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ قربانی کرنے والوں کی حاجت سے جو گوشت بچ جائے اسے مستحقین میں تقسیم کرنے کا انتظام کرے۔

۲۔ مذبحہ خانوں کے منتظمین کو اس بات کی تاکید کر دی جائے کہ قربانی کرنے والے اصحاب اور فقراء و مساکین کو حسبِ طلب گوشت لینے میں کسی قسم کی تکلیف یا رکاوٹ پیش نہ آئے۔ کیونکہ یہی شریعتِ مطہرہ کا منشاء ہے۔ اس کے بعد یہ منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ باقیماندہ گوشت کو ضائع نہ ہونے دیں اور سرد خانوں میں اسے محفوظ کر کے مستحق افراد میں تقسیم کرنے کا انتظام کریں۔

۳۔ کھالوں، ہڈیوں، آنتوں اور خون اور فضلات وغیرہ کو بھی بروقت محفوظ کر لیا جائے تاکہ جائز شرعی طریقہ پر ان سے استفادہ کیا جا سکے اور جن چیزوں کی بیع جائز ہو انہیں بیچ دیا جائے۔ اس سے جو رقم وصول ہو اُسے فقراء و مساکین کے مصالح میں خرچ کر دیا جائے

۴۔ بہت سے حاجی قربانی کے لیے جانور خرید لیتے ہیں جو شرعی شرائط پر پُورے نہیں اُترتے، مثلاً کمزور یا کم عمر ہوتے ہیں یا ان میں کوئی عیب ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں مذبحہ خانوں کے پاس ایک وسیع میدان قربانی کے جانوروں کی خرید و فروخت کے لیے مخصوص کر دینا چاہیے جس میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ وہاں وہی جانور لائے جائیں جو شرعی حیثیت سے قربانی کے لائق ہوں۔ اور جو جانور اس معیار پر پُورے نہ اُتریں انہیں وہاں لانے کی اجازت ہی نہ دی جائے۔

۵۔ مجلسِ اساسی حکومت سے توقع رکھتی ہے کہ وہ حج کے منتظمین کو آئندہ سال ۱۳۸۶ھ کے حج سے پہلے ان قراردادوں پر عمل درآمد کرنے کی ہدایت کر دے گی۔

۸- مقامِ ابراہیم علیہ السلام مجلس اساسی کو یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا ہے کہ مقام ابراہیم کی زائد عمارت کو منہدم کرنے کے لیے ہماری مقرر کردہ خاص کمیٹی نے جو سفارشات کی تھیں ان کی تنفیذ کے لیے رابطہ کے سکرٹریٹ نے مناسب کارروائی کی ہے۔ اور مجلس اس بات پر شاہ فیصل کی حکومت کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اس نے ان سفارشات پر عمل درآمد کا فیصلہ کر لیا ہے۔

(یاد رہے کہ مقامِ ابراہیم اور کعبہ کے درمیان جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے طواف کرنے والوں کو سخت مشکل پیش آتی ہے، حتیٰ کہ بسا اوقات کثرتِ ازدحام سے اموات تک ہو جاتی ہیں۔ اس لیے مجلس نے یہ تجویز کیا تھا کہ مقامِ ابراہیم کی عمارت توڑ دی جائے اور وہ پتھر جو اصل میں مقامِ ابراہیم ہے اپنی جگہ پر رہنے دیا جائے، اور اس پر بلور کا ایک مضبوط اور مدوّر قبہ بنا دیا جائے۔)

۹- شیخ محمد عبداللہ سابق وزیر اعظم کشمیر کی نظربندی رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس اساسی حکومتِ ہند سے اپیل کرتی ہے کہ وہ کشمیری مسلمانوں بلکہ دنیا کے سارے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ کو رہا کر دے اور اس طویل قید و بند کے بعد ان کی آزادی کو بحال کر کے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا رویہ اختیار کرے۔

۱۰- اخوان المسلمون کا مسئلہ مصر میں جماعت اخوان المسلمون کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے اس کے متعلق مجلس اساسی کو جو تفصیلات موصول ہوئی ہیں ان کا جائزہ لینے کے بعد مجلس یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس کی طرف سے حسبِ ذیل بیان جاری کیا جائے:

"مختلف ذرائع سے متواتر یہ خبریں مل رہی ہیں کہ مصر میں جماعت اخوان المسلمون کے جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان پر سخت ظلم توڑے جا رہے ہیں اور انہیں بڑی دردناک سزائیں دی

جاری ہیں۔ سب سے بڑھ کر اس جور و ستم کا نشانہ وہ عظیم داعیانِ اسلام بن رہے ہیں جن کا اس کے سوا کوئی قصور نہیں کہ وہ دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور حکومت کے ذمہ دار لوگوں کو اسلامی اصولوں کے اتباع کی نصیحت کرتے ہیں۔

رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس اساسی اس بات کی دل سے خواہاں ہے کہ وہ مسلم ممالک کے داخلی معاملات میں قطعاً دخل نہ دے، مگر اس کے باوجود جب وہ دیکھتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خاطر مخلصانہ سعی وجہد کرنے والی ایک مشہور و معروف مومن جماعت کو نشانۂ ظلم بنایا جا رہا ہے تو وہ اس پر اپنے شدید رنج و الم کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس مجلس کی رائے میں یہ بات کسی طرح گوارا کیے جانے کے قابل نہیں ہے کہ عین اس وقت جبکہ دنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اعداءِ اسلام کی سرگرمیاں جاری ہیں اور بعض ملکوں میں نامور مسلمان لیڈروں کے قتل تک نوبت پہنچ چکی ہے، دنیائے اسلام کے محبوب ملک مصر پر یہ دھبہ لگے کہ اس کی اپنی ہی سرزمین میں اسلام کی آواز دبائی جائے اور اس کے داعیوں پر ظلم توڑا جائے۔

مجلس اساسی مصر کے اصحابِ حل و عقد سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اہلِ ایمان کے خون کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔ اور مسلمانوں میں مصر کو جو عزت حاصل ہے اسے داغدار نہ کریں۔ اور ان اعیانِ اسلام کو عزت و احترام کے ساتھ رہا کر دیں۔

مجلس یہ بھی فیصلہ کرتی ہے کہ اسلامی اور عربی ممالک کے فرمانرواؤں اور اقوام متحدہ اور عرب لیگ کے جنرل سکرٹریوں کو تار بھیجے جائیں اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ دوستانہ طریقہ سے اس معاملہ میں دخل دے کر اس ظلم و ستم کو بند کرائیں۔

مجلس رابطۂ عالم اسلامی کے سیکرٹریٹ کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اپنے سارے ممکن وسائل اس صورتِ حال کی اصلاح کیلیے استعما

۱۱۔ مسلم نوجوانوں کی تنظیم مجلس نے اس اسکیم پر غور کیا جو اس کے بعض محترم ارکان کی طرف سے عالمِ اسلام کے مسلم نوجوانوں کی ایک الیسی تنظیم قائم کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے جس کا مقصد نوجوانوں کی صحیح رہنمائی کرنا اور دنیا کے مختلف حصوں میں نوجوانوں کی جو تنظیمات کام کر رہی ہیں ان کے درمیان رابطہ پیدا کرنا ہو۔ مجلس اس اسکیم سے اتفاق کرتی ہے اور یہ کام رابطۂ عالم اسلامی کے سکرٹریٹ کے سپرد کرتی ہے کہ وہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری اقدامات کرے۔

(بقیہ اشارات)

کرتی رہتی ہے۔ اس فوج کے ایک مشہور کمانڈر ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے پچھلے دنوں زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کی تجویز پیش کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کا ایک حصہ ترقیاتی سرگرمیوں کے بڑھتے ہوئے مصارف میں صرف کیا جائے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس تجویز کو ہر لحاظ سے غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"درحقیقت زکوٰۃ کوئی ٹیکس نہیں ہے بلکہ نماز روزے اور حج کی طرح ایک عبادت اور رکن اسلام ہے۔ جس طرح نماز کی رکعتیں شارع کی مقرر کردہ ہیں اور کسی اجتہاد سے ان میں ردوبدل نہیں ہو سکتا اسی طرح زکوٰۃ کی جو شرح شارع علیہ السلام نے مقرر کر دی ہے اس میں بھی کمی بیشی کرنے کا کوئی مجاز نہیں ہے۔ آج مسلمان قلب و ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ ان عبادتوں کو جس وجہ سے ایک متعین شکل و صورت میں انجام دے رہے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ان کو اس شارع نے مقرر کیا ہے جس کے برحق ہونے پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ اگر مختلف زمانوں کی بدلتی ہوئی حکومتیں ان میں ردوبدل کرنے لگیں تو مسلمان عبادات کے خلوص سے بھی محروم ہو جائیں گے، اور آخرکار ان عبادات کا بھی وہی حشر ہو گا جو حکومتوں کے عائد کردہ ٹیکسوں اور قواعد و ضوابط کا ہوتا ہے کیونکہ لوگ نہ وقت کے حکمرانوں اور قانون ساز مجالس کے ممبروں پر ایمان لائے ہیں، نہ ان کے متعلق وہ خلوص کے ساتھ کبھی یقین رکھ سکتے ہیں کہ جو قاعدے اور ضابطے اور ٹیکس یہ لوگ مقرر کر رہے ہیں وہ سراسر برحق ہیں، نہ ان کے بارے میں یہ عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں کبھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر ہم ان کے احکام کی چوری چھپے بھی خلاف ورزی کریں گے تو ہماری عاقبت خراب ہو

جائے گی۔ مزید برآں مجوزہ کا یہ بیان بھی قطعی غلط ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی ترقیات اور دفاع سمیت ریاست کی دوسری ضروریات پر صرف کرنے کے لیے فرض کی گئی ہے۔ ہر شخص سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۶۰ پڑھ کر دیکھ سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی رُو سے زکوٰۃ کے مصارف دراصل کیا ہیں۔ ان مصارف میں خواہ کتنی ہی کھینچ تان کی جائے، سماجی اور ثقافتی ترقیات اور ریاست کی عام ضروریات تک ان کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا۔ قرآن جن مقاصد کے لیے زکوٰۃ فرض کرتا ہے ان کے لیے شریعت کی مقرر کردہ شرح ہر زمانے میں بالکل کافی ہے اور اگر کسی وقت کوئی غیر معمولی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو خیرات و صدقات کے لیے عام اپیل کر کے اس عارضی ضرورت کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ زکوٰۃ کو ان مصارف کے لیے مخصوص رکھتے ہوئے عام اجتماعی ضروریات کے لیے مسلمان حکومتیں ہر زمانے میں ٹیکس عائد کرتی رہی ہیں اور آج بھی کر سکتی ہیں۔ کوئی شرعی حکم اس میں مانع نہیں ہے۔"

ڈاکٹر فضل الرحمٰن   اس مدلل بیان کے جواب میں کوئی معقول بات تو نہ کہہ سکے لیکن انہوں نے متعین طور پر مولانا مودودی کی کسی تحریر کا حوالہ دیئے بغیر ان پر یہ الزام عائد کر دیا کہ وہ بھی اس سے پہلے زکوٰۃ کی شرح میں تبدیلی کا خیال ظاہر کر چکے ہیں۔ عقل یہ باور نہیں کرتی کہ ڈاکٹر صاحب اس مسئلہ کے بارے میں فی الواقع مولانا کے خیالات سے ناواقف ہونگے۔ ۱۹۵۰ء میں حکومتِ پاکستان نے زکوٰۃ کے متعلق ایک مفصل سوالنامہ جاری کیا تھا جس کا سوال نمبر ۱۸ یہ تھا کہ کیا موجودہ حالات کے پیشِ نظر نصاب اور زکوٰۃ کی شرح میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے؟ اس سوالنامے کا جو جواب محترم مولانا نے نومبر ۱۹۵۰ء کے ترجمان میں ارشاد فرمایا تھا وہ آج بھی ثبوت کے لیے موجود ہے اور ڈاکٹر صاحب کے الزام کی پُرزور

تردید کرتا ہے۔ انھوں نے فرمایا:

"شارع کے مقرر کردہ حدود اور مفادیر میں رد و بدل کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھل جائے تو پھر ایک زکوٰۃ ہی کے نصاب اور شرح پر زد نہیں پڑتی بلکہ نماز، روزہ، حج، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ترمیم و تنسیخ شروع ہو جائے گی اور یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو سکے گا۔ نیز یہ کہ اس دروازے کے کھلنے سے وہ توازن و اعتدال ختم ہو جائے گا جو شارع نے فرد اور جماعت کے درمیان انصاف کے لیے قائم کر دیا ہے۔ اس کے بعد پھر افراد اور جماعت کے درمیان کھینچ تان شروع ہو جائے گی۔ افراد چاہیں گے کہ زکوٰۃ کے نصاب اور شرح میں تبدیلی ان کے مفاد کے مطابق ہو اور جماعت چاہے گی کہ اس کے مفاد کے مطابق انتخابات میں یہ چیز ایک مسئلہ بن جائے گی۔ نصاب گھٹا کر اور شرح بڑھا کر اگر کوئی قانون نیا دیا گیا تو جن افراد کے مفاد پر زد پڑے گی وہ اسے اس خوش دلی کے ساتھ نہ دیں گے جو عبادت کی اصل روح ہے۔ بلکہ ٹیکس کی طرح چٹی سمجھ کر دیں گے اور حیلہ سازی اور گریز دونوں ہی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ بات جواب ہے کہ حکم خدا اور رسول سمجھ کر ہر شخص سر جھکا دیتا ہے اور عبادت کے جذبے سے بخوشی رقم نکالتا ہے اس صورت میں کبھی رہ ہی نہیں سکتی جبکہ پارلیمنٹ کی اکثریت اپنے حسب منشا کوئی نصاب اور کوئی شرح لوگوں پر مسلط کرتی رہے۔"

اس واضح تحریر کے ہوتے ہوئے مولانا محترم کے بارے میں یہ گمراہ کن خیال پھیلانا کہ وہ شرح زکوٰۃ میں تبدیلی کو جائز سمجھتے ہیں یا کبھی جائز سمجھتے تھے، صریح ظلم و زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟

مطبوعات

جہادِ قلم | تالیف جناب عاصل کرنالی ۔ ناشر: فرینڈز پبلیکیشنز۔ ملتان ۔ صفحات ۱۲۸ قیمت ایک روپیہ ۔

یہ جناب عاصل کرنالی کی اُن ولولہ انگیز نظموں کا مجموعہ ہے جو اُن کے اسلامی احساسات کی ہر لحاظ سے شارح اور ترجمان ہیں۔ شاعر کے فکر میں سلامتی، اس کے جذبات میں سلجھاؤ اور الفاظ میں احتیاط کا پہلو غالب ہے ۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی وقتی اور عارضی تاثر کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ ذہن نے ایک خاص نصب العین کو پوری طرح اپنا کر ان تاثرات کا اظہار کیا ہے ۔ معیار کتابت و طباعت اچھا ہے ۔

دنیائے اسلام کے معاشی حالات (انگریزی) | تالیف: پروفیسر محمود احمد بریلوی ۔ ملنے کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۵۲۹۴ ۔ کراچی نمبر ۲ ۔ قیمت ۴ روپے

اس کتابچے کے فاضل مصنف جناب پروفیسر محمود احمد بریلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ اس سے پہلے اسلام اور دنیائے اسلام پر اُن کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ اس کتابچے میں انہوں نے مسلمان ممالک کے معاشی ذرائع اور وسائل کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ اگر ان کے درمیان اشتراک کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو وہ معاشی اعتبار سے بھی دنیا کی ایک مؤثر اور فیصلہ کن قوت بن سکتے ہیں اور انہیں کسی دوسرے ملک کا دست نگر ہونے کی بھی کوئی ضرورت پیش نہیں آسکتی ۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۴۰